داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

رمضان المبارک کے دوران خصوصی رعایتی قیمت
صرف 2500 روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

رمضان المبارک ۱۴۴۳ھ

اپریل ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دُعا اور عبادت کا ربط و تعلّق

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 71

شمارہ : 4

رمضان المبارک 1443ھ

اپریل 2022ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِ تعاون: 400 روپے

اس شمارے کی قیمت: 80 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: **www.tanzeem.org**

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ’’دارُالاسلام‘‘ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

پاکستان کا معاشرتی نظام — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن 13

سورۃ الصَّفّ (مکمل) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خصوصی مضمون 35

دعا اور عبادت کا ربط و تعلق — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حسنِ انتخاب 60

دو روزے — مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

شَھْرٌ عَظِیْمٌ شَھْرٌ مُبَارَکٌ 69

رمضان المبارک کا جامع پروگرام — عاطف محمود

75 رجوع الی القرآن و استقبالِ رمضان — عبدالرزاق کوڈواوی

معرکۂ روح و بدن 81

فتنۂ دجّال اور درپیش چیلنجز — آصف حمید

حقوق و فرائض 89

میرا گھر میری ذمہ داری — انجینئر سیّد نعمان اختر

حسنِ معاشرت 103

عورت کا سماجی مقام — ارسلان اللہ خان

ظروف و احوال 110

اسرائیلی تعلیمی نصاب کی ایک جھلک — رضی الدین سیّد

آدابِ زندگی 119

مہمان زحمت نہیں، رحمت ہے! — حافظ محمد اسد

اسلامی معاشرت 125

عقیقہ: احکام و فضائل — احمد علی محمودی

انوارِ ہدایت 131

صلہ رحمی کی اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

علومِ قرآنی 135

تفسیر اور تاویل اور ان کا باہمی فرق — پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

پاکستان کا معاشرتی نظام

قرآن کریم کا ہر قاری جانتا ہے کہ اس آخری آسمانی صحیفے میں جتنی تفصیل سے اور جتنے واشگاف انداز میں انسان کے معاشرتی معاملات کا ذکر ہے اُس کا عُشرِ عَشیر بھی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی دوسرے گوشے کے بارے میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی اور اِسلام آخری دین ہے' لہٰذا قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ کے ذریعے اگرچہ زندگی کے تمام گوشوں کے حوالے سے انسان کو بھرپور تعلیمات اور ہدایات دے دی گئیں لیکن خاص طور پر معاشرتی اور سماجی سطح پر اسلام ایک واضح اور مکمل نقشہ سامنے لاتا ہے۔ گھر کو بنیادی یونٹ قرار دے کر اہل خانہ کی دینی تعلیم و تربیت پر اصرار کرتا ہے تاکہ ایک صالح معاشرہ کی بنیاد پڑ سکے۔ اسی تربیت کے زیر اثر یہ دعویٰ کیا جاسکتا تھا کہ اکیلی اور نہتی عورت بھی دور دراز کا سفر کرے تو کوئی اُس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا۔ البتہ جب سے دنیا پر مغرب اور اس کی تہذیب کا غلبہ ہوا ہے' وہ تمام معاشرتی و سماجی اقدار جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہیں رفتہ رفتہ اس کے کردار و عمل سے محو ہوتی جارہی ہیں اور ان کی جگہ غیر انسانی، غیر اخلاقی اور حیوانی نوعیت کی عادات و خصائل نے لے لی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب قوم مغلوب قوم پر تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

برصغیر ہند انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے وسط تک انگریز کے زیر تسلط رہا۔ بدقسمتی سے انگریز نے دوسری غالب قوتوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی تہذیب اہلِ ہند پر مسلّط کرنے کی کوشش کی۔ برصغیر میں دو بڑی قومیں بستی تھیں: ہندو اور مسلمان۔ ہندو تو صدیوں سے بیرونی قوتوں کے غلام تھے' اُن کا تو محض آقا تبدیل ہوا۔ لہٰذا معاشرتی سطح پر تبدیلی سے انہوں نے کوئی بڑا فرق محسوس نہ کیا جبکہ مسلمانانِ ہند کو پہلی مرتبہ غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑا۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے ایک باقاعدہ سماجی نظام عطا فرمایا' چنانچہ اسلامی تہذیب اسی سماجی نظام پر اُستوار رہی جو اُن کے دین کا ایک لازمی جزو ہے۔ انگریز نے اس فرق کو سمجھتے ہوئے مسلمانوں کو خاص طور پر ٹارگٹ کیا۔ عجب بات یہ ہے کہ انگریز کے دورِ حکومت میں تو مسلمانوں نے ان کوششوں کو زیادہ کامیاب نہ ہونے دیا اور بہت کم لوگوں نے حکمرانوں کی تہذیب اور ان کے طرزِ بودوباش کو

اپنایا' لیکن بدقسمتی سے قیامِ پاکستان کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان مغربی تہذیب اور انگریزی طرزِ زندگی سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ اُنہوں نے مغرب کی بے حیا تہذیب کو خود پر مسلط کرلیا اور اسلامی تہذیب سے ہی نہیں بلکہ مشرق کی اقدار سے بھی منہ موڑ لیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت کی جو تصاویر یا ویڈیوز ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں مَردوں کے لباس اسلامی اور مشرقی اَقدار کے مطابق تھے۔ اکثریت کا لباس شلوار قمیص' پگڑی' تہبند تھا۔ اسی طرح عورتوں میں پردہ' چادر اور باحیا لباس رائج تھا' یہاں تک کہ مسلم اکثریتی علاقوں میں بعض غیر مسلم عورتیں بھی ''پردہ'' کرتی نظر آتی تھیں۔ یہ بھی رواج تھا کہ مسلمان عورت کو ڈولی میں بٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔ یہ اُس معاشرے کی بات ہے جب برصغیر میں انگریز کا تقریباً دو سو سالہ تسلط مکمل ہو رہا تھا۔

کیا یہ تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ انگریز نے اس دو سو سالہ دورِ تسلّط میں ہمارے معاشرتی نظام کو بدلنے کی کوشش نہ کی ہو؟ یقیناً اس نے ایسا کیا..... لیکن اس کے باوجود وہ ہماری معاشرت کو تباہ نہ کرسکا۔ اگرچہ قائداعظم محمد علی جناح اور ان جیسے چند بڑے لیڈرز کا لباس مغربی تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد ایک دن بھی قائداعظم نے مغربی لباس نہیں پہنا بلکہ پوری طرح سے مشرقی طرز بودوباش اختیار کرلی' مغربی لباس کو مکمل طور پر ترک کردیا۔ چونکہ نیا ملک اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آرہا تھا' لہٰذا قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ہمارا آئین قرآن ہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہماری معاشرت قرآن و سُنّت کے احکامات کی عملی تعبیر ہوتی' لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہماری جس معاشرت کو انگریز اپنے دو سو سالہ دورِ تسلّط میں تباہ نہ کرسکا وہ آزادی کے بعد ہم نے خود مغرب کی نقالی میں تباہ کرڈالی۔ آج جب ہم بازاروں میں نکلتے ہیں تو ایک اسلامی معاشرہ تو دور کی بات' یہ تو مشرقی اقدار کا حامل معاشرہ بھی نظر نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مرد اور ایک عورت سے نسلِ انسانی کی افزائش کا سلسلہ شروع کیا اور دونوں کے حقوق و فرائض متعین کردیے۔ بحیثیت انسان مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں البتہ ہر ایک کا دائرہ کار مختلف ہے۔ مغربی تہذیب نے اس نظام کو تلپٹ کردیا' مرد اور عورت ایک دوسرے کے دائرہ کار میں گھس گئے اور فرائض و حقوق کے حوالے سے غیر فطری انداز اپنا لیا گیا۔ مغرب کا سماجی نظام تو مکمل تباہی و بربادی کا شکار ہو چکا ہے۔ اب مغرب نے اپنی تمام کوششوں کا رُخ اسلامی ممالک کی طرف پھیر دیا ہے تاکہ سوشل انجینئرنگ پروگرام اور دوسرے خوشنما ناموں کے ذریعے ہمارے خاندانی نظام کو بھی تباہ کردے۔ وہ بے حیا معاشرے کو ہم پر مسلّط کرنے کی کوشش میں مصروف ہے جب کہ اسلام ایک باعفت و باحیا معاشرہ کی تشکیل چاہتا

ہے۔ اسلامی تعلیمات میں حیا پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اہلِ ایمان مَردوں اور عورتوں کو سورۃ النور میں نگاہوں اور شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اہلِ ایمان میں فحاشی پھیلانا چاہتے ہیں اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے۔

آج مسلمانوں سے حیا ختم کرنے کے لیے اغیار تو محنت کر ہی رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے انہیں ہمارے ہی معاشرے سے ایسے دست و بازو بھی میسّر ہیں جو مغرب زدہ ہیں اور اس معاملے میں اُس کے سہولت کار بنے ہوئے ہیں۔ بے حیائی کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے خواتین کو عزّت و شرف سے محروم کر کے مَردوں کے ہاتھوں ان کا استحصال کرنے اور اشتہاری جنس بنانے کے لیے نت نئے پروگرام ترتیب دیے جا رہے ہیں۔ قرآن حکیم نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے خیرِ اُمّت ہونے کی وجہ ہی نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی ذمہ داری ادا کرنا ہے‘ لہٰذا بے حیائی کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنا نہ صرف ہماری دینی بلکہ قومی ذمہ داری بھی ہے۔ قومی ذمہ داری اس لیے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ ہم یہاں اللہ کے دین کے مطابق اپنا سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی نظام قائم کریں گے۔ قائداعظم نے بار بار اپنے خطبات میں یہی فرمایا کہ بحیثیت مسلمان قوم ہماری طرز بود و باش غیر مسلموں سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ ہمارا جینا مرنا‘ ہماری اقدار و روایات اور رسوم و رواج سب کچھ مختلف ہے۔ صرف اسی مقصد کے تحت مسلمانانِ برصغیر نے جان و مال کی بے مثال قربانیاں پیش کیں اور اپنے گھر بار‘ زمین و جائیداد اور کاروبار و ملازمت چھوڑ کر پاکستان کو اپنا وطن بنایا۔ اس کے پسِ پردہ صرف ایک ہی خواب تھا کہ پاکستان میں سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی طور پر خلافت راشدہ کے دور کی یاد تازہ ہوگی‘ ورنہ ہندوؤں سے الگ ہو کر علیحدہ ملک بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی! انفرادی طور پر نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج کا اہتمام تو متحدہ ہندوستان میں بھی ہو رہا تھا۔ لہٰذا بحیثیت پاکستانی قوم بھی یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن و سُنّت کے اصولوں کے مطابق اسلامی معاشرت قائم کرنے کی کوشش کریں۔

اب ہم پاکستان کی معاشرت پر اثر انداز ہونے والے چند اہم واقعات اور محرکات کا تذکرہ کریں گے تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ ہمارے معاشرے کو تباہی سے دوچار کرنے میں کس کا کتنا ہاتھ ہے۔ عائلی قوانین کے حوالے سے بعض سرکاری دستاویزات مثلاً شادی‘ طلاق کی رجسٹریشن وغیرہ تو فی نفسہٖ یقیناً بے ضرر ہیں‘ بلکہ دنیوی معاملات کو طے کرنے کے لیے سودمند ہیں‘ لیکن مرد کو ایک سے زائد شادی کرنے کے لیے کسی حکومتی مصالحتی ادارے کا یا پہلی بیوی یا بیویوں کی اجازت کا محتاج بنا دینا یکسر خلافِ شریعت ہے۔ اللہ تعالیٰ مرد کو ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی قانون سازی سے اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ اس اجازت کے راستے میں رکاوٹ

کھڑی کرنا لازماً خلافِ شریعت ہے۔ العلیم اور الحکیم ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور اُس نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت اپنے علم اور حکمت کی بنیاد پر دی ہے‘ لہٰذا اگر کوئی حکومت یا معاشرہ ایسی قانون سازی کرتا ہے جس سے مرد کا یہ اختیار مفلوج‘ منسوخ یا محدود ہوتا ہے تو یہ مالکِ کائنات کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ یہ ظلم ہے جو کسی صورت روا نہیں رکھا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف مرد کو یہ اجازت تو دیتا ہے لیکن دوسری طرف خود قرآن پاک میں اور اپنے آخری رسول ﷺ کی مبارک سیرت و سُنّت کے ذریعے مرد کی شخصیت کو ایسی اخلاقی تعلیم و تربیت سے مزیّن کرتا ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں عدل کو بنیاد بنا کر توازن قائم کر سکے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں ایک فوجی طالع آزما نے ایک منکرِ حدیث کی ذمہ داری لگائی کہ وہ ’’عائلی قوانین‘‘ ترتیب دے اور پھر اُس نے خود ڈکٹیٹر کی حیثیت سے اُنہیں زبردستی مسلمانوں پر مسلّط بھی کر دیا۔ یہ عائلی قوانین مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے علماء نے خلافِ اسلام و شریعت قرار دے دیے۔ ان کے خلاف احتجاج بھی ریکارڈ کروایا‘ لیکن تقریباً ساٹھ سال سے کوئی بھی سول یا فوجی حکمران انہیں تبدیل نہ کر سکا۔ یہ عائلی قوانین اسلام کے معاشرتی نظام سے کس قدر متصادم ہیں‘ اس کا علماء کرام تفصیل سے زبانی اور تحریری طور پر ذکر کر چکے ہیں اور ہم ہرگز اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس میں کمی بیشی کر سکیں۔ قارئین اس حوالے سے علماء کرام کے دیے گئے فتاویٰ سے استفادہ کریں۔

عائلی قوانین جیسے داخلی محرکات کی مزید تفصیل دینے سے پہلے ہم کچھ بیرونی عوامل کا ذکر کریں گے جو پاکستانی معاشرت پر اثر انداز ہوئے۔ عورت کو اپنے حقوق سے آشنا کرانے کے نام پر طاغوتی قوتوں نے دجالی ایجنڈے کے تحت کچھ بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کیں۔ بظاہر ان کا مقصد عورت کے مسائل کو حل کرنا بتایا گیا۔ پہلی کانفرنس ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ دوسری کانفرنس میکسیکو میں منعقد ہوئی جس میں ۶۷ ممالک نے حصہ لیا۔ تیسری کانفرنس ۱۹۸۵ء میں نیروبی میں ہوئی جس میں ۱۳۰ ملک شریک ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں قاہرہ کانفرنس ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں وہ کانفرنس منعقد ہوئی جس نے دنیا کی عورت کو ’’بیجنگ پلیٹ فارم فار ایکشن‘‘ (BPFA) دیا۔ اس کانفرنس میں دنیا بھر سے تیس ہزار سے زائد خواتین نے شرکت کی۔ ۲۰۰۰ء میں نیویارک میں عورتوں کی عالمی کانفرنس اقوامِ متحدہ کے ایک خصوصی اجلاس کے طور پر منعقد کی گئی جس میں این جی اوز نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی اور دستاویز کی تیاری میں بھرپور طور پر اثر انداز ہوئیں۔ اسے بیجنگ پلس فائیو (B+5) کا نام دیا گیا۔ ۲۰۰۵ء میں بیجنگ کانفرنس کی دسویں سالگرہ کو B+10 کا نام دیا گیا‘ جسے پاکستان میں بھی بھرپور انداز میں منایا گیا۔

’’بیجنگ پلیٹ فارم فار ایکشن‘‘ کے ۱۲ مخصوص میدان کار ہیں جو عورت کی پوری زندگی کا احاطہ

کرتے ہیں۔ اُس میں تعلیم، صحت، غربت، انسانی حقوق، ذرائع ابلاغ، ماحول، معیشت، ادارہ جاتی نظام، مسلح جارحیت، فیصلہ سازی میں شمولیت اور تشدد کے موضوعات شامل ہیں۔ تمام حکومتیں اس کی پابند ہیں کہ عورت کے لیے اس حوالے سے جو کام ہو چکے ہیں، جو ابھی باقی ہیں اور جو حکمتِ عملی ترتیب دی جاتی ہے، اُس کی ایک جامع رپورٹ ہر سال اقوامِ متحدہ کو پیش کریں۔ گویا خوشنما نعروں کی آڑ میں مغربی اور دجّالی تہذیب کو ہمارے معاشرے پر مسلّط کرنے اور شعائرِ اسلام سے دوری پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

پاکستانی معاشرت اور معاشرتی اقدار کو تلپٹ کرنے میں کچھ بین الاقوامی معاہدات نے بھی کلیدی رول ادا کیا۔ اس حوالے سے سب سے خوفناک حملہ ۱۹۷۹ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے پاس کیے جانے والا ''سیڈا'' (CEDAW) معاہدہ ہے جو مخفف ہے:

"Convention on the Elimination of All Forms of Discrimination Against Women "

اسے ۳دسمبر ۱۹۸۱ء کو قانونی حیثیت دی گئی اور اب تک دنیا کے ۱۸۱ ممالک اس کو منظور اور لاگو کر چکے ہیں۔ پاکستان نے ۱۹۹۶ء میں اس کو منظور کیا۔ حیرت کا مقام ہے کہ جن مٹھی بھر ممالک نے اسے منظور اور لاگو نہیں کیا ان میں سے ایک دنیا میں خواتین کے حقوق کا سب سے بڑا علمبردار خود امریکہ ہے۔ ''سیڈا'' کی ۱۶ بنیادی شقوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس کے ذریعے معاشرتی خاص طور پر خاندانی نظام کو تباہ کرنا مقصود ہے۔ ظاہری طور پر سیڈا کے نکات جو بھی ہوں لیکن پس پردہ ان کے مقاصد بہت واضح ہیں جن کی ایک اجمالی فہرست درج ذیل ہے:

۱) عورتیں مَردوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ۲) مرد کو تعددِ ازدواج کی اجازت نہیں ہے۔ ۳) بچوں کے نام ان کی ماؤں کے نام پر رکھے جائیں۔ ۴) عورت کی کوئی عدّت نہیں۔ ۵) مرد کو عورت پر برتری حاصل نہیں ہے اور باپ کو اپنی بیٹیوں کی سرپرستی کا کوئی حق نہیں۔ ۶) مرد اور عورت کی میراث ایک سی ہے۔ ۷) ایک مرد اپنے جیسے مرد سے شادی کر سکتا ہے، ایک عورت اپنے جیسی عورت سے شادی کر سکتی ہے۔ ۸) خواتین کو اسقاطِ حمل کا حق حاصل ہے۔ ۹) میاں بیوی دونوں کے لیے شادی سے باہر جنسی تعلقات کوئی جرم نہیں ہیں۔ ۱۰) عورت جس سے چاہے تعلق قائم کرے اور جب چاہے جدا ہو جائے، اور جب چاہے دوبارہ جڑ جائے۔ ۱۱) شادی کی عمر اٹھارہ سال کے بعد ہے۔ وغیرہم

جو ملک یا معاشرہ اسلام سے وابستہ ہونے کے باوجود ان مغربی دجالی قوانین اور نظریات کے ساتھ کھڑا ہونا اور اس کا دفاع کرنا چاہتا ہے اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سُنّت کا انکار کر رہا ہے، جس کے دنیوی اور

اُخروی لحاظ سے بدترین نتائج برآمد ہوں گے۔

خالقِ کائنات خود یا اُس کی مخلوق میں سے کوئی جب لفظ انسان استعمال کرتا ہے تو اُس کی مراد مرد اور عورت دونوں ہوتے ہیں، البتہ ترجیح اور فضیلت مرد کو حاصل ہے۔ ترجیح یوں کہ مرد کو پہلے پیدا کیا گیا اور فضیلت یوں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں اپنی روح پھونکنے کے بعد فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اُس وقت تک ظاہری اور جسمانی طور پر عورت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ ترجیح اور فضیلت ظاہر کرنے کے فوری بعد عورت کو بھی سامنے لایا گیا۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی خطا پر اُنہیں دنیا میں اتار دیا گیا، جہاں آدم اور حوّا (علیہما السلام) کے ملاپ سے نسلِ انسانی کا آغاز ہوا۔ گویا حضرت آدمؑ اگر انسانوں کے باپ ہیں تو حوّاؑ انسانوں کی ماں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مقدّس جوڑا انتہائی قدر و منزلت کا حق دار ہے، لیکن گزرے وقتوں میں جب انبیاء اور رُسل علیہم السلام کی تعلیمات کو مسخ کیا گیا تو مَردوں نے عورت کو انتہائی ڈی گریڈ کیا، یعنی اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اُونچے مقام سے گرا دیا۔ یہ اُس وقت کی موجود دنیا میں ہر جگہ ہوا۔ بچی کی پیدائش پر باپ اپنے معاشرے میں یوں منہ چھپاتا پھرتا تھا جیسے اُس سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب میں دورِ جہالت میں بچیوں کو زندہ درگور کرنے جیسے انتہائی ظالمانہ فعل کی نوبت بھی آجاتی۔ مغرب میں چند صدیاں پہلے تک عورت نفرت کا استعارہ تھی۔ انگریزی زبان کے لفظ woman سے مراد یہ لیا جاتا تھا کہ عورت man کی wo یعنی غلام ہے۔

۱۵۰۰ سال پہلے تک دنیا میں عورت کی حالت یہ تھی کہ وہ مرد کے پاؤں کی جوتی سمجھی جاتی اور ظلم و ستم کا شکار رہتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اُسے اس لیے برداشت کر لیا جاتا تھا کہ وہ مرد کی ضرورت تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی دنیا پر رحمت خصوصی نازل ہوئی اور اُس نے اپنے آخری رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کو آخری اور حتمی کتاب دے کر دنیا میں بھیجا۔ دین اسلام کا کیچ ورڈ ''عدل'' ہے۔ اس دین نے انقلاب برپا کر دیا۔ انسانوں کی انفرادی زندگی میں ہمالائی تبدیلی آگئی جبکہ اجتماعی زندگی کے تینوں گوشوں میں ایسا نظام کارفرما کیا کہ آغاز میں جزیرہ نمائے عرب اور بعد ازاں معلوم دنیا کا بہت بڑا حصّہ جنّت نظیر بن گیا۔ اہم ترین اور کلیدی تبدیلی معاشرتی نظام میں آئی۔ گھریلو زندگی میں ایک طرف مرد کو قوّام قرار دیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں یہ مرد کی قانونی حیثیت ہے، اس لیے کہ گھر ایک یونٹ ہے، ایک ادارہ ہے اور کسی ادارے کا ایک ہی سربراہ ہو سکتا ہے۔ کوئی ادارہ نہ بغیر سربراہ کے چل سکتا ہے اور نہ ہی ایک سے زائد سربراہوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عورت کو اخلاقی سطح پر ایسا اعلیٰ اور ارفع مقام دیا کہ مرد کو بھی سر اُٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا لیکن آدم علیہ السلام کے سوا ہر نبی اور رسول کو عورت نے ہی جنم دیا۔

عزّت‘ خدمت اور احترام کے حوالے سے ماں کا درجہ باپ پر تین گُنا زیادہ بتایا گیا۔ پھر یہ کہ وراثت میں اگر مرد کا حصّہ عورت کے حصہ سے دوگنا ہے تو عورت اپنے باپ کی وراثت میں بھی حصّہ دار ہے اور شوہر کی وراثت میں بھی حصہ دار ہے۔ قصہ کوتاہ‘ مرد اور عورت کے مابین جو عدل اور توازن دین اسلام میں ہے وہ بے نظیر اور لاجواب ہے۔ اس سے ایک انچ آگے یا پیچھے ہونا ظلم ہے‘ انتشار ہے اور معاشرے کی تباہی و بربادی کا باعث ہے۔

مغرب کو جب دنیا میں بالادستی حاصل ہوئی تو اُس نے اس فطری اور عادلانہ نظام میں مداخلت کی۔ یہ مغرب کی ایسی سنگین غلطی تھی کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی اور آسائش اور سہولتوں کی فراوانی کے باوجود آج انسانی زندگی عذاب بن چکی ہے۔ Sleeping Pills کے بغیر سو یا نہیں جاتا۔ ناکام شادیوں اور طلاقوں کی شرح اس قدر بڑھ چکی ہے کہ مغرب میں لوگ اب شادی کرنے سے ہی انکاری ہیں۔ امریکہ کے ایک سابق صدر کہتے تھے کہ آنے والے وقت میں امریکہ بغیر شادی کے پیدا ہونے والے افراد کا ملک ہوگا۔ مادّی دولت سے بھری ہوئی اس دنیا میں خودکشیاں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ شمار کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ مغرب عورت کو پُرسکون گھر سے کھینچ کر بازار میں لے آیا ہے۔ عورت سے بہت بڑا دھوکا کیا گیا ہے۔ حقوق اور مساوی درجہ دینے کا فریب دے کر روزگار کمانے کی ذمہ داری اُس پر بھی ڈال دی گئی ہے۔ نسوانی حسن کو کاروبار کی بڑھوتری کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پروڈکٹ پُرکشش بنانے کے لیے عورت کو استعمال کیا گیا۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ عورت کی ذاتی دولت اور وسائل میں اضافے سے اُس کی عزت اور احترام میں بھی اضافہ ہوگا۔

بدقسمتی سے اکیسویں صدی کے آغاز میں پاکستان پر ایک فوجی طالع آزما جبراً مسلّط ہوگیا۔ اس ناجائز حکمران کو مغرب خاص طور پر امریکہ کی سیاسی حمایت درکار تھی۔ پھر یہ کہ وہ خود ذہنی طور پر ایک عیاش بلکہ اوباش انسان تھا۔ بعدازاں اُس کے بہت سے سکینڈلز بھی سامنے آئے۔ اُس نے انٹرنیشنل میڈیا کو ایک انٹرویو دونوں ہاتھوں میں کتے کے پلّے اُٹھا کر دیا۔ درحقیقت وہ مغرب کو اپنی روشن خیالی کا پیغام دے رہا تھا تاکہ اُس کی حکومت کو مستحکم کرنے میں مغرب اپنا رول ادا کرے۔ صدر پرویز مشرف کے سیاہ دور میں بدنامِ زمانہ ’’تحفظِ نسواں بل‘‘ ۱۵ نومبر ۲۰۰۶ء کو پارلیمان سے منظور کیا گیا جس پر تمام مکاتب فکر کے علماء نے پُرزور مذمّت کرتے ہوئے اسے خلافِ شریعت قرار دیا۔ یہ درحقیقت سیکولر اور لبرل دنیا کو خوش کرنے‘ ہمارے ملک کے مذہب بے زار طبقہ کی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور پاکستان میں مغربیت کو فروغ دینے کی ایک مذموم کوشش تھی۔ اس حوالے سے علماء و محققینِ اسلام کی بیش بہا تحریریں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو چکی ہیں‘ جن سے قارئین استفادہ

کر سکتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے صحیح ادراک ہو سکے گا کہ اُس دور کے ابن الوقت سیاسی اتحادی‘ جن میں سے اکثر آج بھی سیاسی میدان میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں‘ اُنہوں نے پاکستان کے اسلامی معاشرتی نظام و طرزِ بود و باش اور خاندانی نظام پر کس قدر خطرناک حملے کیے۔ پھر یہ کہ اُس وقت اور اُس کے بعد کے ادوار میں مغرب زدہ این جی اوز کو ہمارے معاشرتی نظام اور اسلامی و مشرقی اقدار سے کھلواڑ کرنے کی بے لگام آزادی دی گئی۔

وزراتِ داخلہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۸ء میں پاکستان میں بیس ہزار سے زائد این جی اوز کام کر رہی تھیں جن کی اکثریت بیرونی خاص طور پر مغربی ممالک اور اداروں کی امداد سے چل رہی تھیں۔ یہ داستان بھی ہماری ملکی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ پاکستان میں ویلنٹائن ڈے‘ نیو ایئر نائٹ اور بسنت جیسے بیہودہ تہوار اگرچہ کم تر سطح پر پہلے بھی منائے جاتے تھے لیکن صدر مشرف نے حکومتی وسائل سے ان میں بے تحاشا اضافہ کر دیا۔ علاوہ ازیں مخلوط میراتھن دوڑ کا اضافہ کر کے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس دور میں پاکستانی معاشرہ پر عریانی‘ بے حیائی اور فحاشی کا زبردست حملہ کیا گیا۔ یقیناً اُس کے نہایت بُرے اثرات معاشرے پر مترتّب ہوئے‘ خاص طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انتہائی افسوسناک مناظر دیکھنے میں آئے۔ جنسی ہراسگی اور بے راہروی کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ٹیلی ویژن کی سکرین پر انتہائی ناشائستہ اور نازیبا مناظر سامنے آنا شروع ہوگئے۔ سوشل میڈیا فحاشی اور بے حیائی کی تشہیر میں سب پر سبقت لے گیا۔ گویا پاکستان کے معاشرتی نظام اور نظریۂ پاکستان کی بنیاد اور جڑ پر ایٹمی حملہ کیا گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ ہم اسلامی تہذیب سے بہت دور نکل چکے ہیں اور ہمیں اس خوفناک حملے سے بہت نقصان ہوا ہے‘ البتہ ہمارے معاشرے میں موجود اسلام کے مجاہد افراد اور تناظیم ابھی بھی مزاحمت کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی تعلیمات حاصل کرنا‘ اسلامی اور مشرقی اقدار کو آگے بڑھانا صاف نظر آتا ہے۔ اس مزاحمت کو کمک بلکہ تقویت پہنچانے کی اشد ضرورت ہے‘ وگرنہ اس ابلیسی اور دجالی تہذیب کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو اس محاذ پر سود و زیاں سے لاتعلق ہو کر بے جگری سے لڑنا ہوگا۔ اسلام کا معاشرتی نظام ہمارے دفاع کی آخری لائن ہے۔ ہم سیاسی اور معاشی محاذ پر تو پہلے ہی شکست کھا چکے ہیں‘ معاشرتی نظام کی حفاظت ہمارے لیے اتنی ضروری ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں یہ جنگ محلوں‘ گلیوں اور گھروں کی سطح پر لڑنا ہوگی۔ عریانی اور بے حیائی ہی نہیں‘ بے پردگی اور غیروں کے رسم و رواج کے خلاف بھی سیسہ پلائی دیوار بننا ہوگا۔ یہ ہماری عزّت و عفت کا مسئلہ ہے۔ یہ ہماری چادر اور چاردیواری کا مسئلہ ہے۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ۞۞۞

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الصَّفِّ

تمہیدی کلمات

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گروپ (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) کے اندر ان دو سورتوں کی ظاہری مماثلت بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کا آغاز تسبیح سے ہو رہا ہے اور المُسَبِّحات میں سے صرف یہی دو سورتیں ہیں جو ترتیب میں اکٹھی ایک ساتھ ہیں۔ باقی تینوں المُسَبِّحات (سورۃ الحدید' سورۃ الحشر اور سورۃ التغابن) میں سے کوئی بھی دو سورتیں اکٹھی نہیں ہیں۔

ان دونوں سورتوں کے آغاز میں تسبیح کے صیغے ان کی نسبتِ زوجیت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ (دو جنسوں یا دو چیزوں کے مابین نسبتِ زوجیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے ان میں باہم مشابہت ہونے کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکمیلی خصوصیت کی حامل ہیں' یعنی دونوں مل کر کسی خاص مقصد کی تکمیل کرتی ہیں۔) سورۃ الصّف کی پہلی آیت میں تسبیح کے ذکر کے لیے ماضی کا صیغہ (سَبَّحَ لِلّٰہِ .....) آیا ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کے آغاز میں مضارع کا صیغہ (یُسَبِّحُ لِلّٰہِ .....) ہے اور فعل مضارع میں زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس طرح ان سورتوں کے آغاز کی آیات میں تینوں زمانے (ماضی' حال اور مستقبل) اکٹھے ہونے سے تسبیح کے دائمی اور ابدی ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے' کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے' یہ تسبیح ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے' ہر دم ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

سورۃ الصّف کا مضمون غلبۂ دین اور اس کے لیے عملی و انقلابی جِدّ و جُہد سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے اس سورت کے چار حصے ہیں۔ پہلے تین حصے چار چار آیات پر مشتمل ہیں' جبکہ آخری حصے میں دو آیات ہیں۔ پہلی چار آیات کی حیثیت تمہید کی بھی ہے' اور ایک اعتبار سے ان میں اصلی پیغام کا خلاصہ بھی آ گیا ہے۔ دوسرے حصے کی چار آیات میں سابقہ اُمّتِ مُسلمہ یعنی یہود کے

طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ تیسرے حصے میں بعثتِ محمدی ﷺ کا مقصد بیان ہوا ہے اور اہلِ ایمان کو جہاد کی پُرزور دعوت دی گئی ہے' جبکہ آخری حصے یعنی آخری دو آیات میں اس سورت کے پیغام کو قبول کرنے والے لوگوں کا ذکر ہے کہ دنیا میں بھی ان لوگوں کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کیا جائے گا اور آخرت میں بھی انہیں اعلیٰ مدارج و مراتب سے نوازا جائے گا۔

یہاں پر یہ فلسفہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ غلبۂ دینِ اسلام کے لیے جہاد یا انقلابی جدّ و جُہد کا بنیادی مقصد اور اصل ہدف انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ انسانی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''انسان'' نے بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی غلامی میں بہت سختیاں جھیلی ہیں اور اس غلامی کا طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کے لیے قربانیاں بھی بہت دی ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ نادار و محروم عوام اگر کبھی استحصالی طبقے کے ظلم سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے بھی تو وہ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' کے مصداق پہلے سے بڑے ظالم کے پنجے میں جا پھنسے۔ گویا کھجور سے گر کر کسی گہری کھائی میں جا گرے۔ فرانس میں بھوکوں مرتے مظلوم مزدوروں اور کسانوں نے بادشاہوں کی لوٹ کھسوٹ اور عیاشیوں کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور جانوں کی قربانیاں دیں تو اس کا نتیجہ انقلابِ فرانس کی صورت میں سامنے آیا۔ اَن گنت قربانیوں اور خوفناک خونریزی کے نتیجے میں نظام تو بدل گیا لیکن عوام الناس کی مصیبتوں اور محرومیوں کا ازالہ نہ ہو سکا۔ کہنے کو تو بادشاہت کی جگہ عوام الناس کی اپنی حکومت (جمہوریت) نے لے لی' لیکن حقیقت میں وہ سرمایہ داروں کی آمریت ہی کا ایک بہروپ تھا۔ چنانچہ ظالمانہ ٹیکسوں کا سلسلہ جمہوری حکومت کے تحت بھی حسبِ سابق جاری رہا اور مزدور کو اس کی محنت کا منصفانہ معاوضہ ملنے کا خواب اس کی ''اپنی حکومت'' میں بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا کہ پہلے اس کی خون پسینے کی کمائی پر بادشاہ اور شہزادے عیش کرتے تھے' اب ان کی جگہ کارخانہ دار اور سرمایہ دار اس کا خون نچوڑ نچوڑ کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین کرنے لگے۔ علّامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ع ''خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب'' کہ سرمایہ دار مزدوروں کی رگوں سے خون نچوڑ کر اپنے لیے سرخ شراب تیّار کرتے ہیں۔ دوسری طرف انقلابِ روس کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہاں کے عوام بھی زار کے آہنی شکنجے سے نکل کر یک جماعتی آمریت (one party dictatorship) کے سنہری پنجرے میں آ پھنسے۔ غرض آقا بدلتے رہے' نظاموں کے نام بدلتے رہے' لیکن نہ بدلی تو مزدور کی قسمت نہ

بدلی۔ اس طبقے کی محرومیاں جیسی کل تھیں ویسی ہی آج بھی ہیں۔ کل مزدور کے بچے تختِ شاہی کے سائے تلے بھوکے سوتے تھے اور آج مزدور کے بچے شجرِ جمہوریت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روٹی کو ترستے ہیں۔

دراصل یہ مسئلہ کسی ایک طبقے کا مسئلہ نہیں' اور نہ ہی یہ کسی ایک ملک کے مزدوروں اور کسانوں کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی انصاف کا شفّاف نظام پوری دنیا کی ضرورت ہے جس کی تلاش میں نسلِ انسانی صدیوں سے دربدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اُس نے دنیا میں جتنے بھی رسول بھیجے ان سب کا مشن یہی تھا کہ انسانیت کو عدل وقسط کے شفّاف نظام کے ثمرات سے بہرہ ور کیا جائے۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں فلسفۂ انقلاب عریاں ترین صورت میں موجود ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔''

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ وہ قسط (عدل) کو قائم کرنے والا ﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بحیثیتِ اُمّت اس دنیا میں جو کردار ادا کرنے کا فریضہ سونپا وہ بھی بنیادی طور پر یہی ہے کہ وہ یہاں عدل و انصاف قائم کریں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ سورۃ المائدۃ میں یہی حکم الفاظ کی دوسری ترتیب کے ساتھ اس طرح آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ (آیت ۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ!''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ مشن کے ساتھ انبیاء و رسلؑ تو پے در پے آتے رہے اور نسلِ انسانی تک اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی پہنچاتے رہے' لیکن اس کے باوجود لوگ بار بار گمراہ ہوتے رہے۔ کسی قوم نے جوشِ عقیدت میں اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا تو کسی نے اپنے

پیغمبر کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی' لیکن معاشرے کے اجتماعی نظام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کسی نے نہ کی' تاوقتیکہ اجتماعی عدل وقسط کے قیام کا یہ مشن نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو سونپا گیا۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ''رسالت'' کے جس مشن کا ذکر جمع کے صیغے (لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا) میں آیا ہے' حضور ﷺ کے حوالے سے سورۃ الصّف کی اس آیت میں اس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبہ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر۔''

بہرحال پوری انسانی تاریخ میں یہ اعزاز صرف اللہ کے آخری رسول حضرت محمد عربی ﷺ کو حاصل ہوا کہ آپ ﷺ نے عرب معاشرے سے ظالمانہ نظام کی بیخ کنی کر کے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم کر دیا۔ گویا آپ ﷺ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے اس مشن کی تکمیل فرما دی جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں آیا ہے اور اسی لیے آپؐ رسولِ کامل ہیں۔ حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پوری دنیا کے حوالے سے نظامِ عدل وقسط کے قیام کا یہ مشن اب آپؐ کی اُمّت کو منتقل ہو چکا ہے' جس کے لیے اُمّت کو منظّم اور مسلسل جِدّوجُہد کرنی ہے۔

سورۃ الصّف اپنے موضوع کے اعتبار سے اس قدر جامع اور پُرتاثیر سورت ہے کہ اگر کسی بندۂ مسلمان کو یہ ایک سورت بھی سمجھ میں آ جائے تو اُس کے لیے زندگی کا راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ جہاد وقتال کے حوالے سے اس سورت کے احکام پر عمل کرنے کے لیے اُسوۂ رسولؐ اور منہجِ نبویؐ کا اتباع ضروری ہے۔ اگر کوئی جماعت منہجِ نبویؐ کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھے بغیر جوشِ جہاد میں ہتھیار اُٹھا کر میدان میں کود پڑے گی تو اس کا یہ عمل خودکشی کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ منہجِ نبویؐ سے راہنمائی لیتے ہوئے اس کٹھن راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مرحلہ وار آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے مرحلے میں دعوت وتبلیغ کے ذریعے ''مردانِ کار'' کو جمع کرنا ہوگا۔ ایسے مردانِ کار جو اللہ کی محبّت کے مقابلے میں دُنیوی محبتوں کو تج کر کے واقعتاً آخرت کے طالب بن چکے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ایک ایک لفظ ان کی روحوں کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا

ہو: ﴿فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ (الشوریٰ) ’’پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا ساز و سامان ہے‘ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ربّ پر توکّل کرتے ہیں‘‘۔ پھر ان مردانِ کار کا تربیت کے ضروری مراحل سے گزرنا اور اپنے لیڈر کے ساتھ سمع و طاعت کے سخت ڈسپلن کے تحت مربوط ہونا بھی ضروری ہے۔ بہرحال جب مذکورہ صفات کے حامل افراد اچھی خاصی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں اور تربیت و تنظیم کے ضروری مراحل بھی طے کر چکیں تب ان کے امیر یا لیڈر کو حالات و ماحول کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اقدام کے مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

مختصراً یوں سمجھیں کہ منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ کے بنیادی مراحل دو ہیں: تیاری کا مرحلہ اور تصادم یا ٹکراؤ کا مرحلہ۔ مَیں نے اپنی کتاب ’’منہجِ انقلابِ نبویؐ‘‘ میں پہلے مرحلے کو منہجِ انقلابِ نبویؐ کا ’’اساسی منہاج‘‘ جبکہ دوسرے مرحلے کو ’’تکمیلی منہاج‘‘ کا نام دیا ہے اور ظاہر ہے اس پورے منہاج کا مرکز و محور تو قرآن ہی ہے۔ علّامہ اقبال نے انقلابِ اسلامی کے ان دو مراحل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے: ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن   چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

جبکہ اکبر الٰہ آبادی نے ان دو مراحل کی ترتیب کا فلسفہ بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ان دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے: ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

گویا بدر کے میدان میں اہلِ ایمان نے جو کامیاب معرکہ لڑا اس کی تیاری کا آغاز بہت پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں فردِ واحد کی سوچ بچار سے ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے مکّہ کی گلیوں میں دعوت و تبلیغ کی صبر آزما مہم تنِ تنہا شروع کی۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والے ’’مردانِ کار‘‘ نے آپ ﷺ کی نگرانی و راہنمائی میں ۱۴ سال تک تزکیہ و تعلیم‘ ذہنی و نفسیاتی تربیت‘ سخت سے سخت جسمانی تشدد کی برداشت‘ ہر صورت میں ہاتھ بندھے رکھنے کی مشق اور ایسے کئی جاں گداز مراحل کامیابی سے طے کیے تو تب کہیں جا کر وہ تصادم کے مرحلے میں قدم رکھنے اور بدر و حنین جیسے معرکے

سر کرنے کے قابل ہوئے۔ آج ہمیں بھی غلبہ دین کی جدّ و جُہد کے دوران حضور ﷺ کے اسی منہج کی پیروی کا اہتمام کرنا ہے۔

آیات ۱ تا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾﴾
’’تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے‘ اور وہ بہت زبردست ہے‘ کمال حکمت والا‘‘۔

آیت ۲ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾ ’’اے مسلمانو! تم کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟‘‘

اس آیت میں زجر و توبیخ اور جھنجھوڑنے کا وہی انداز پایا جاتا ہے جو اس سے قبل ہم سورۃ الحدید میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ بلکہ یہ اسلوب زیر مطالعہ مدنی سورتوں میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ قبل ازیں سورۃ الحدید کے تمہیدی کلمات میں اس اسلوب کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان سورتوں کے زمانہ نزول (۵ ہجری کے بعد) تک پرانے مسلمانوں کی نسبت نومسلموں کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔ ایمان کی گہرائی اور جذبہ ایثار و قربانی کے حوالے سے نو وارد مسلمانوں کی کیفیت چونکہ ’’السابقون الاوّلون‘‘ اور ابتدائی دور کے اہلِ ایمان کی سی نہیں تھی‘ اس لیے مسلمانوں کے ایمان و عمل کے اجتماعی معیار کے اوسط میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی اور اسی وجہ سے انہیں اس انداز میں جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ ہر زمانے کے لوگوں سے مخاطب ہے‘ اس لیے اس آیت کو پڑھتے ہوئے یوں سمجھیں کہ آج یہ ہم سے سوال کر رہی ہے کہ اے ایمان کے دعوے دارو! تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ تم اللہ پر ایمان کا اقرار بھی کرتے ہو

اور دن رات اُس کے احکام کو پاؤں تلے روندتے بھی رہتے ہو! تم رسول اللہ ﷺ کی ذات سے عشق و محبّت کے دعوے بھی کرتے ہو‘ لیکن جب عمل کے میدان میں آتے ہو تو آپ ﷺ کی سُنّتوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہو! ذرا تصوّر کیجیے! آج اگر اللہ کا کلام نازل ہو تو ہمارے ایمان‘ ہمارے کردار اور ہمارے عمل پر کیا کیا تبصرہ کرے! اور اگر آج حضور ﷺ خود تشریف لا کر اپنی اُمّت کی حالت دیکھ لیں تو کیسا محسوس کریں!

آیت ۳ ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ ’’بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔‘‘

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اس سے بڑی ڈانٹ اور گرفت اور بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اس ڈانٹ اور اظہارِ بیزاری کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور محبّت کا معیار بھی بتا دیا ہے کہ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کو کیسے لوگ پسند ہیں اور یہ کہ وہ کیسے لوگوں سے محبّت کرتا ہے تو سنو!

آیت ۴ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ ’’اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں‘ جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔‘‘

آج کے زمانے میں ’’بنیانِ مرصوص‘‘ reinforced concrete wall کو کہا جائے گا۔ ایسی دیواریں بڑے بڑے dams کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ البتہ پرانے زمانے میں اگر کسی دیوار کو غیر معمولی طور پر مضبوط کرنا مقصود ہوتا تو چنائی کرنے کے بعد اس کے اندر پگھلا ہوا تانبا ڈالا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں عام طور پر ’’بنیانِ مرصوص‘‘ کا ترجمہ ’’سیسہ پلائی ہوئی دیوار‘‘ کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس طریقہ سے ’’سیسہ پلائی ہوئی دیوار‘‘ بنانے کا تصوّر سورۃ الکہف کی آیت ۹۶ میں بھی ملتا ہے۔ ذوالقرنین بادشاہ نے یاجوج ماجوج کے حملوں سے حفاظت کے لیے لوہے کے تختوں کی مدد سے دیوار کھڑی کرنے کے بعد حکم دیا تھا: ﴿اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۹۶﴾ ’’اب لاؤ مَیں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں‘‘۔

بہرحال یہاں ’’بنیانِ مرصوص‘‘ سے مراد میدانِ جنگ میں مجاہدین کی ایسی صفیں ہیں جن میں کوئی رخنہ یا خلا نہ ہو اور ایک ایک مجاہد اپنی جگہ پر اس قدر مضبوطی سے کھڑا ہو کہ دشمن کے لیے صف کے

کسی ایک حصے کو بھی دھکیلنا ممکن نہ ہو۔

یہاں ضمنی طور پر یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ نماز کے لیے ہماری صف بندی کی بھی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔ ایک صف کے تمام نمازیوں کو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا چاہیے اور ان کے پیروں کے محاذات بھی ایک ہونے چاہئیں‘ یعنی تمام لوگوں کے پاؤں ایک سیدھ میں ہوں تاکہ صف سیدھی رہے۔ دو آدمیوں کے درمیان خلا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جماعت کی صف میں دو نمازیوں کے درمیان خلا کی جگہ سے شیطان گزر جاتا ہے۔ جماعت کے لیے صف بندی کا اہتمام کرانا دراصل امام کی ذِمّہ داری ہے‘ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ائمہ مساجد اس طرف کوئی توجّہ ہی نہیں دیتے۔ البتہ اس ضمن میں ضرورت سے زیادہ شدّت بھی مناسب نہیں‘ جیسے بعض لوگ غیر معمولی طور پر ٹانگیں پھیلا کر دوسرے نمازی کے پاؤں پر اپنا پاؤں چڑھا دیتے ہیں اور دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بنتے ہیں۔

بہرحال ہمارے لیے اس آیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل ’’قتال فی سبیل اللہ‘‘ ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں سب سے اعلیٰ خیر یا نیکی کو summum bonum کہتے ہیں۔ ہر فلسفۂ اخلاق میں ایک ’’خیرِ اعلیٰ‘‘ (summum bonum) یا بلند ترین نیکی (highest virtue) کا تصوّر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اصل پیغام کو اگر فلسفہ کی زبان میں بیان کریں تو یوں کہیں گے کہ اسلام کے نظامِ فکر اور اس کے نظریۂ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا ’’خیرِ اعلیٰ‘‘ (summum bonum) قتال فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہو اُسے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی اپنی جان اس کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کرنا ہوگی۔ جو شخص اس قربانی کے لیے تیّار نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبّت و قربت کا دعویٰ بھی نہ کرے۔ بقول غالبؔ ع

’’جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں!‘‘

یہاں سورت کے پہلے حصے کا مطالعہ مکمل ہو گیا۔ اب آئندہ چار آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔ یہود کی تاریخ کے حوالے سے دراصل مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ قول و عمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلوتہی ہی وہ اصل جرم تھا جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جس پر اب تم فائز کیے گئے ہو۔

آیات ۵ تا ۸

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ
رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا
یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝۵ وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ
اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ
التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا
جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۶ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا
یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۷ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ
بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸

آیت ۵ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ﴾ ’’اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا دے رہے ہو؟‘‘

یہ جس ایذا کا ذکر ہے وہ ذاتی نوعیت کی بھی ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسل علیہم السلام بھی آخر انسان تھے اور طبع بشری کے تحت ہر طرح کی تکلیف کو محسوس بھی کرتے تھے۔ جیسے سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک تکلیف دہ معاملے کا ذکر آیا ہے یا جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکینِ مکّہ کی طرف سے بھی ذاتی نوعیت کی تکالیف پہنچائی جاتی رہیں اور منافقین کے طرزِ عمل سے بھی شدید ذہنی و قلبی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بنی اسرائیل کی طرف سے اصل اور سب سے بڑی ایذا وہ تھی جو حکمِ جہاد سے ان کے انکار کی وجہ سے آپؑ کو پہنچی تھی۔ اپنی قوم کے اس انکار کے بعد آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی تھی اس کے ایک ایک لفظ میں شدّتِ تکلیف کے احساسات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں آپؑ کی دعا کے یہ الفاظ:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ
الْفٰسِقِیْنَ ۝۲۵﴾ (المائدۃ)

’’موسیٰؑ نے عرض کیا: پروردگار، مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے، تو اب تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔‘‘

﴿وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ﴾ ’’جبکہ تم جانتے ہو کہ مَیں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔‘‘

میرے نزدیک یہاں لفظ ’’رسول‘‘ نبی کے معنی میں آیا ہے۔ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی طرف ’’نبی‘‘ کی حیثیت سے تھی، بطور ’’رسول‘‘ نہیں تھی۔ جبکہ قومِ فرعون کی طرف آپؑ بحیثیت ’’رسول‘‘ مبعوث ہوئے تھے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۴۶﴾ (الزخرف)

’’اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف تو اُس نے کہا کہ (دیکھو) میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔‘‘

کسی قوم کی طرف ’’رسول‘‘ کی بعثت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہمیشہ یہ رہا ہے کہ متعلقہ قوم پر اپنے رسول کی فرمانبرداری لازم ہوتی تھی۔ چنانچہ جو قوم اپنے رسولؑ کی دعوت کو رد کر دیتی تھی اسے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا اطلاق بنی اسرائیل پر نہیں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پے در پے نافرمانی کے باوجود انہیں ہلاک نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف قومِ فرعون آپؑ کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک کر دی گئی۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت نبی کی تھی، جبکہ آلِ فرعون کی طرف آپؑ ’’رسول‘‘ مبعوث ہو کر آئے تھے۔

﴿فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ﴾ ’’پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔‘‘

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں لوگوں کی ہدایت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ایک بنیادی اصول اور قانون بیان ہوا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن مجید کی اُن آیات کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو گمراہ کرنے یا اُن کے دلوں پر مہر کر دینے کا ذکر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہدایت کے راستے کو پہچان لینے کے بعد بھی اسے اختیار نہ کرے بلکہ گمراہی کی روش پر ہی چلتے رہنے کو ترجیح

دے‘ پھر وہ اس راستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت کی حدود پھلانگ کر ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ ہو (point of no return) تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اُس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس پر ہدایت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے‘ یعنی بندہ جب سمجھتے بوجھتے ہوئے ٹیڑھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کا دل ہمیشہ کے لیے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!)

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾ ’’اور اللہ فاسقوں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

آیت ۶ ﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ ’’اور یاد کرو جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! مَیں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف‘‘

اس آیت میں بنی اسرائیل کے دوسرے دور کا ذکر ہے جب اُن کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول بن کر آئے۔ بحیثیت رسول آپؑ کی بعثت کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ کے الفاظ ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ میں آیا ہے۔

﴿مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ ’’مَیں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اُس کی جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے‘‘

﴿وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ ’’اور بشارت دیتا ہوا ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے‘ ان کا نام احمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہوگا۔‘‘

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶﴾ ’’پھر جب وہ (عیسیٰؑ) آئے اُن کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔‘‘

اس کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے ساتھ بنی اسرائیل کا تیسرا دور شروع ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کے بعد بنی اسرائیل کو واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ (بنی اسرائیل:۸) ’’ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے‘ اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے‘‘۔ یعنی اے بنی اسرائیل! تم

ہمارے لاڈلے تھے‘ ہم نے تمہیں خود برگزیدہ کیا تھا: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۲﴾ (الدّخان) مگر تم نے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو راندۂ درگاہ بنا لیا۔ بہرحال ہماری رحمت اور محبّت کے دروازے اب بھی تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اگر تم لوگ توبہ کر کے اپنی روش درست کر لو تو ہم اب بھی تمہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لینے کے لیے تیّار ہیں۔ لیکن اس کے لیے تمہیں خود کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے قدموں میں ڈالنا ہوگا اور قرآن کو اپنا راہبر ماننا ہوگا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹﴾ (بنی اسرائیل) ’’یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے اور بشارت دیتا ہے اُن اہلِ ایمان کو جو نیک عمل بھی کریں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔‘‘

تم پر واضح ہونا چاہیے کہ اب ہمارے قصرِ رحمت کا شاہدرہ ’’قرآن‘‘ ہے۔ اگر تم ہماری رحمت کی پناہ میں آنا چاہتے ہو تو تمہیں اسی شاہدرہ کی راہ سے گزر کر آنا ہوگا۔ لیکن اگر تم نے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح نہ کی‘ اپنی نافرمانیاں اسی طرح جاری رکھیں تو پھر ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا کہ ماضی میں تمہارے ساتھ ہوتا رہا ہے: ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾۔ جیسے ماضی میں ہمارے حکم پر تم لوگ بخت نصر (Nebukadnezar)‘ یونانیوں‘ شامیوں‘ رومیوں وغیرہ کے ہاتھوں بار بار نشانِ عبرت بنتے رہے ہو ویسے ہی ایک مرتبہ پھر ہم تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا دلوائیں گے۔ (بیسویں صدی میں نازیوں کے ہاتھوں یہود کا جو انجام ہوا وہ بھی عبرت انگیز ہے۔ ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ ’’ہولوکاسٹ‘‘ میں ۶۰ لاکھ افراد مارے گئے۔)

آیت ۷ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ ’’اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تراشے‘‘

﴿وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ﴾ ’’درآں حالیکہ اُسے بلایا جا رہا ہو اسلام کی طرف!‘‘

یعنی اب اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم لوگوں کو دعوتِ ایمان و اسلام دے رہے ہیں اور تم لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے اُنؐ کی نبوت و رسالت اور قرآن کے بارے میں اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷﴾ ’’اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی)

ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

اب اگلی آیت میں یہودیوں کی ان کوششوں اور سازشوں کا ذکر ہے جو انہوں نے حضور ﷺ اور قرآن کے خلاف شروع کر رکھی تھیں۔ یہ آیت زیر مطالعہ مضمون کے کلائمکس کا درجہ رکھتی ہے:

آیت ۸ ﴿یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ﴾ ’’وہ تلے ہوئے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا کر رہیں گے‘‘

﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۸﴾ ’’اور اللہ اپنے نُور کا اتمام فرما کر رہے گا‘ خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔‘‘

یہ آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ سورۃ التوبہ میں اس طرح آئی ہے: ﴿یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَیَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۳۲﴾ ’’یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے منہ (کی پھونکوں) سے اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے‘ چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔‘‘

اللہ کے نور کو منہ کی پھونکوں سے بجھانے کے استعارے میں یہودِ مدینہ کی ان بودی کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضور ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اُس وقت کر رہے تھے۔ یعنی وہ سامنے آ کر براہِ راست مقابلہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے‘ افواہیں اڑاتے‘ درپردہ سازشوں کے جال بُنتے رہتے‘ کبھی قریش کے پاس جاتے کہ تم مدینہ پر حملہ کرو اور کبھی کسی دوسرے قبیلے کو سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کے خلاف ابھارتے۔ سورۃ الحشر میں ان کی بزدلی اور اندرونی کمزوری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿لَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ جَمِیۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (آیت ۱۴) کہ یہ لوگ کھلے میدان میں اکٹھے ہو کر تمہارا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے‘ ہاں چھپ چھپا کر دیواروں کی اوٹ سے وہ تم پر ضرور وار کریں گے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس آیت کے مضمون کی ترجمانی اپنے ایک شعر میں یوں کی ہے: ؎

نُورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

یہاں یہ اصولی نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس آیت اور اس مضمون کی حامل قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مفہوم کا دائرہ صرف حضور ﷺ کے زمانے کے یہودیوں اور ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں تک ہی محدود نہیں‘ بلکہ ان میں تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے یہودیوں اور ان کی ان سازشوں کا ذکر ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ موجودہ دور میں اگرچہ یہ لوگ پوری عیسائی دنیا کو اپنی مُٹھی میں لے کر عالمِ اسلام کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں‘ مگر قرائن بتاتے ہیں کہ ان کے فیصلے کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ کے مطابق اللہ کے نور کا اتمام یعنی روئے ارضی پر دینِ اسلام کا غلبہ تو ایک طے شدہ امر ہے۔ اس کے لیے قیامت سے پہلے دنیا کو ایک انتہائی خوفناک جنگ کا سامنا کرنا ہے۔ اس جنگ میں یہودی اور عیسائی مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے۔ احادیث میں اس جنگ کو اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی کا نام دیا گیا ہے‘ جبکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی اصطلاح میں اسے ’’ہرمجدون‘‘ (Armageddon) کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں یہودی مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائیں گے اور اسلام واحد طاقت کے طور پر پوری دنیا پر غالب آ جائے گا۔ یہ ہے آیت کے الفاظ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ کے مفہوم کا خلاصہ جس کی تفصیل ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔

آیات ۹ تا ۱۲

﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۹ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۱۰ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۱۱ۙ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ وَ یُدۡخِلۡکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ وَ مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۱۲ۙ﴾

یہاں سے اس سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ آیت ۹ میں حضور ﷺ کی بعثت کا ذکر ہوا ہے:

آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ ’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظامِ زندگی پر‘‘

حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے باعث قرآن مجید میں اسے تین بار (اس مقام کے علاوہ سورۃ التوبہ آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح آیت ۲۸ کے طور پر) دہرایا گیا ہے۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے قرآن مجید میں بشیر‘ نذیر‘ مذکّر‘ شاہد‘ معلّم وغیرہ الفاظ مشترک استعمال ہوئے ہیں‘ لیکن اس آیت کا مضمون اور اسلوب صرف محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے۔ الھُدٰی سے مراد یہاں وہ ہدایت نامہ (قرآن) ہے جو آپ ﷺ پر کامل ہو گیا‘ جبکہ آپ سے پہلے تمام انبیاء کو اپنے اپنے دور میں جو میزان (شریعت) عطا ہوتی رہی تھی حضور ﷺ کی بعثت میں وہ کامل ہو کر ’’دین الحق‘‘ یعنی سچّے اور عادلانہ نظامِ زندگی کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل وقسط کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دیا جائے۔ یہ تھا حضور ﷺ کی بعثت کا مشن جسے تکمیل کے لیے آپؐ ہمارے سپرد فرما گئے تھے۔ لیکن ہم نے تو اس مشن کو کبھی اپنایا ہی نہیں۔ ہمارا مشن تو یہ ہے کہ حلال وحرام طریقے سے جیسے بھی ہو‘ دولت اکٹھی کرو‘ پھر اسی دولت سے صدقہ وقربانی دو‘ حج کرو اور رمضان میں ہر سال عمرے کے لیے چلے جایا کرو۔ ہمارا سارا زور rituals پر ہے اور دین اگر دنیا میں پامال ہے تو ہوتا رہے‘ ہماری بلا سے! تصوّر کریں‘ اگر آج صرف ایک سال میں حج پر اکٹھے ہونے والے افراد ہی سروں پر کفن باندھ کر غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کے لیے میدان میں کود پڑیں تو دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ مگر افسوس‘ صد افسوس! ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

﴿وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۝۹﴾ ’’اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!‘‘

ظاہر ہے مشرکین کب چاہیں گے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو‘ نظامِ توحید کا نفاذ ہو اور اللہ کی حکومت بالفعل قائم ہو جائے۔ یہاں پر مُشۡرِکُوۡنَ کا لفظ خاص طور پر لائقِ توجّہ ہے۔ اس سے مراد صرف وہ مشرکین ہی نہیں ہیں جو بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ

اللہ کے حضور ان کی سفارش کر دیں گے‘ بلکہ سب سے بڑے مشرک تو وہ ہیں جو دنیا میں خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں‘ جو نمرود اور فرعون کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے مالک ہم ہیں۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا: ﴿اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ﴾ (الزخرف: ۵۱) کہ دیکھو! کیا یہ مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ پورا نہری نظام میرے تابع نہیں ہے؟ تو فرعون کے اس دعوے اور ’’عوام کی حاکمیت‘‘ کے نعرے میں کیا فرق رہ گیا؟ صرف یہی نا کہ وہاں اقتدار کا دعویٰ کرنے والا ایک فرد تھا اور یہاں پوری قوم حاکمیت کی دعوے دار ہے۔ اب ظاہر ہے اگر اس ماحول میں آپ اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگائیں گے اور اللہ کے نظامِ عدل وقسط کے قیام کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہیں گے تو ’’اپنی حاکمیت‘‘ کے یہ دعوے دار خم ٹھونک کر آپ کے مقابلے میں آ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے موقف پر قائم رہیں گے تو ان سے آپ کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور آپ کو مال وجان کی قربانی کی صورت میں اپنے اس موقف کی قیمت چکانا پڑے گی۔ چنانچہ اب اگلی آیات میں اسی صورتِ حال کا ذکر کیا جا رہا ہے:

آیت ۱۰ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۝۱۰﴾ ’’اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟‘‘

آیت ۱۱ ﴿تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ﴾ ’’(وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔‘‘

یعنی اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایسے ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت بھی اسی مفہوم میں اہلِ ایمان کو ایمان لانے کا حکم دے رہی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ...﴾ (آیت ۱۳۶) ’’اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر.....‘‘ گویا یہ ایمان کے دعوے داروں کے لیے ایسا مؤمن بننے کی دعوت ہے جو سورۃ الحجرات کی اس آیت کے معیار پر پورے اترتے ہوں: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ﴾

(آیت ۱۵) ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر، پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑪﴾ ''یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

آیت ۱۲ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''وہ تمہارے لیے تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی''

﴿وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑫﴾ ''اور بہت پاکیزہ مساکن عطا کرے گا رہنے کے باغات میں۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

اصل اور سب سے بڑی فوز و فلاح اور کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ دنیا کی کامیابیوں سے بے نیاز ہو کر اسی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے۔ حتیٰ کہ غلبۂ دین یا اقامتِ دین کے لیے جِدّ و جُہد کا نصب العین بھی آخرت کی کامیابی ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس جِدّ و جُہد میں دُنیوی کامیابی پر نظر رکھیں گے تو اپنی کوششوں کو کامیاب نہ ہوتے دیکھ کر یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے یا الٹے سیدھے طریقے سے (by hook or by crook) مثبت نتائج حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیوی نتائج کو منزل سمجھ لینے کی وجہ سے اس راہ کی بڑی بڑی تحریکیں یا تو مایوسی کے قبرستان میں دفن ہو گئیں یا شارٹ کٹ لگانے کی کوشش میں غلط موڑ مڑ کر اصل راستہ ہی گم کر بیٹھیں۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد کے دوران ہمیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی پر نظر رکھنی چاہیے اور دنیا کی کامیابی یا ناکامی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہم صرف کوشش کرنے کے مکلّف ہیں، اس کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے ہم مکلّف نہیں۔ ہاں اپنی جِدّ و جُہد کے طریق کار پر حالات و ماحول کے مطابق نظر ثانی ضرور کرتے رہنا چاہیے، لیکن بنیادی طور پر ہمارا طریقہ اور راستہ وہی رہنا چاہیے جو منہجِ نبویؐ سے ماخوذ ہو۔ یہ منہج حضور ﷺ کے توسّط سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً

وَّمِنْهَاجًا ۭ﴾ (المائدۃ:۴۸) ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے''۔ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ ہم اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد کی راہیں متعین کرتے ہوئے روشنی اور راہنمائی منہجِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے ہی حاصل کریں۔

آیات ۱۳، ۱۴

وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑬ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ⑭

اب اگلی آیت میں اس ''بونس'' کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی اس دنیا میں بھی عطا کر دیتا ہے، چنانچہ فرمایا:

آیت ۱۳ ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ﴾ ''اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔''

یعنی اس جہاد میں تمہیں دنیا کی کامیابی بھی مل سکتی ہے۔ اگرچہ تمہاری یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قدر اہم نہیں جس قدر تم اسے اہم سمجھتے ہو۔ وہ غلبۂ دین کے لیے تمہاری کوششوں کا محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو آنِ واحد میں دین کو غالب کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو چیز اہم ہے وہ تمہاری جِدّ و جُہد اور اس جِدّ و جُہد میں تمہارا جذبۂ ایثار و خلوص ہے، اور یہی تمہارا اصل امتحان ہے۔ اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہو تو اللہ کے ہاں کامیاب ہو، چاہے دنیوی لحاظ سے تم ناکام ہی رہو۔ لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ بر بنائے طبع بشری تم لوگ اپنی اس جدّ و جُہد کے مثبت نتائج اس دنیا میں بھی دیکھنا چاہتے ہو اور دُنیوی فتح حاصل ہونے پر تم لوگ بہت خوش ہوتے ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ تمہاری خوشی کے لیے وہ بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ''اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح۔''

بس اب اللہ تعالیٰ کی مدد آیا ہی چاہتی ہے اور دنیوی فتح بھی تمہارے قدم چومنے ہی والی

ہے۔ یہ کس مدد اور کونسی فتح کی بشارت ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے غزوۂ احزاب کے حالات وواقعات کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ سورۃ الصّف کی حیثیت سورۃ الاحزاب کے ضمیمے کی سی ہے۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ) آپ مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔‘‘

غزوۂ احزاب کے بعد حضور ﷺ نے صحابہؓ کو یہ خوشخبری ان الفاظ میں سنائی تھی: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) (تفسیر ابن کثیر: ۳۹۶/۶) کہ اب اس سال کے بعد قریش تم پر کبھی چڑھائی نہیں کر سکیں گے‘ بلکہ آئندہ تم لوگ ان پر چڑھائی کرو گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا‘ کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے‘ اب اقدام تمہاری طرف سے ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اگلے سال ۶ ہجری میں حضور ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرے کی نیت سے مکّہ کا سفر اختیار فرمایا‘ جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور قریش کے مابین حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ طے پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاہدے کو ’’فتح مبین‘‘ قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ (الفتح) ’’یقیناً ہم نے آپؐ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔‘‘

دوسری طرف اس بشارت کا تعلق آخرت سے بھی ہے کہ اپنے مال و جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کے نتیجے میں مؤمنینِ صادقین کو جنّت کی نعمتیں بھی ملیں گی اور اللہ کے ہاں انہیں ایک خاص مقام بھی عطا ہوگا۔ اور وہ ہوگا اللہ کے مددگار ہونے کا مقام!

یہاں یہ بات خصوصی طور پر لائقِ توجّہ ہے کہ ان آیات میں عذابِ الیم سے چھٹکارے کو ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ آیت ۱۰ میں یہ بات جس دوٹوک انداز میں واضح کی گئی ہے اسے فزیالوجی کی زبان میں "All or none Law" کہتے ہیں۔ یعنی ایسی صورتِ حال جس میں کوئی چیز واقع ہوتی ہے تو پوری ہوتی ہے اور اگر نہیں واقع ہوتی تو بالکل نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ یا تناسب ممکن نہیں ہوتا۔ ہمارے ارادی عضلات (voluntary muscles) کے سکڑنے کا معاملہ ایسا ہی ہے‘ اگر محرک (stimulus) پورا مل جاتا ہے تو متعلقہ muscle کی پوری contraction ہوتی ہے اور

اگر stimulus کم ہوتا ہے تو contraction بالکل نہیں ہوتی۔ اس مفہوم میں آیت ۱۰ تا ۱۳ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں گے ان کے سب گناہ بھی معاف ہو جائیں گے (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے ایمان و عمل کو درجہ قبولیت مل جائے)‘ انہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا بھی ملے گا اور جنّتِ عدن میں ٹھکانہ بھی نصیب ہوگا۔ صرف یہی نہیں‘ بلکہ دنیا میں انہیں اللہ کی مدد سے فتح بھی ملے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مددگار قرار پائیں گے ـــــ اس کے برعکس اگر ہم لوگ ایمان کے دعوے تو بہت کریں اور اللہ و رسولؐ سے محبّت کے نعرے بھی لگائیں‘ لیکن مذکورہ دو شرائط (ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) پوری کرنے میں سنجیدہ نہ ہوں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا رویّہ اللہ تعالیٰ کی بیزاری کو دعوت دینے کے مترادف ہے: ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصّف) ’’بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں‘‘۔ چنانچہ جو لوگ مذکورہ شرائط کا حق ادا کیے بغیر ہی سمجھتے ہیں کہ وہ آخرت میں نجات پا جائیں گے وہ ایک خود ساختہ خیال کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی سوچ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان آیات کے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یعنی یہ‘ معاذ اللہ‘ کلامِ مہمل ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت ایک طویل آیت ہے اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلۂ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ‘‘

اللہ کے مددگار بننے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے پر کمربستہ ہو جاؤ۔ اور اگر تم اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جِدّ و جُہد کرو گے تو تم محمد عربی ﷺ کے مددگار بھی بن جاؤ گے‘ کیونکہ غلبہ دین کا یہ مشن اصل میں تو اللہ کے رسول ﷺ کا مشن ہے۔ تو اے اہلِ ایمان! آؤ آگے بڑھو! اللہ کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ! جان و مال کا سرمایہ لگاؤ اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے مددگاروں میں اپنا نام لکھوا لو۔

﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ﴾ ’’جیسے کہا تھا عیسیٰؑ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے‘‘

﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾ ’’کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟‘‘

یعنی کون ہے جو میری مدد کرے اللہ کی راہ میں؟ مدد مجھے درکار ہے‘ لیکن مشن اللہ کا ہے۔ اس فقرے میں وہی دو نسبتیں نظر آ رہی ہیں جن کا ذکر سورۃ الفتح کی اس آیت میں حضور ﷺ کی بیعت کے حوالے سے آیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ﴾ (آیت ۱۰)۔ یعنی بیعت حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے لیکن سودا اللہ تعالیٰ سے ہے۔ گویا عملی طور پر اس بیعت میں دو کے بجائے تین ہاتھ ہیں: بیعت کرنے والے کا ہاتھ‘ حضور ﷺ کا ہاتھ اور اللہ کا ہاتھ۔ چنانچہ اللہ کی مدد کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آپ اُس ’’بندے‘‘ کی مدد کریں جو اللہ کے مشن کو لے کر اُس کے راستے پر نکلا ہو۔ اسی فلسفے کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی مدد کے لیے آپؑ کی آواز پر لبیک کہا تھا اور اسی جذبے کے ساتھ حضور ﷺ کے صحابہؓ نے اپنا سب کچھ آپؐ کے قدموں میں نچھاور کر کے ﴿وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗ﴾ (الفتح:۲۹) کی فہرست میں اپنے نام لکھوائے تھے۔ چنانچہ آج بھی اس مشن کو آگے بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے اللہ کا کوئی بندہ خود کو اس مشن کے لیے وقف کر کے ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ کی صدا بلند کرے کہ اے اللہ کے بندو! میں نے تو یکسو ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ مجھے تو اب اس راستے پر چلنا ہی چلنا ہے۔ کوئی ساتھی ملے گا تب بھی چلوں گا اور اگر کوئی ساتھی نہیں ملے گا تب بھی چلوں گا۔ تو آؤ آگے بڑھو اور میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اللہ کے مددگار بن جاؤ!

﴿قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ﴾ ’’حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!‘‘

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مددگار بن گئے۔ بنیادی طور پر اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خلوص و ایثار کا ذکر ہے کہ انہوں نے ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ کی دعوت پر بلا تأمل خود کو پیش کر دیا۔

﴿فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ کَفَرَتۡ طَّآئِفَۃٌ ۚ﴾ ’’تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ (حضرت مسیح علیہ السلام پر) ایمان لے آیا اور دوسرا گروہ کفر پر اڑا رہا۔‘‘

﴿فَاَیَّدۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلٰی عَدُوِّہِمۡ﴾ ’’تو ہم نے مدد کی اُن کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے خلاف‘‘

﴿فَاَصۡبَحُوۡا ظٰہِرِیۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ’’تو (بالآخر) وہی غالب ہوئے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسولؑ کا انکار کرنے والے یہودی مغلوب ہوئے ـــــ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو یہ کامیابی آسانی سے نہیں ملی تھی‘ اس کے لیے ان لوگوں کو تین سو سال تک جاں گداز جِدّ و جُہد کرنی پڑی اور بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ (اس کے مقابل حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی ابتلاء و آزمائش کا دورانیہ چند سال کے عرصے میں سمٹ گیا تھا۔) بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے طویل عرصے تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے مخالفین کی طرف سے تکلیفیں اور سختیاں برداشت کی ہیں اس کی کوئی مثال کسی اور نبیؑ یا رسولؑ کے پیروکاروں میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں ان کی آزمائشوں اور قربانیوں کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسین کے آغاز میں جن تین رسولوں کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں زیادہ تر مفسّرین کی رائے یہی ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ یعنی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ (رسولؑ کے رسول) تھے۔ اسی طرح سورۃ البروج میں جن اہلِ ایمان کا واقعہ بیان ہوا ہے وہ بھی عیسائی تھے اور انہیں بادشاہِ وقت ’ابونواس‘ نے خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اصحاب الکہف جو رومی بادشاہ کے تشدد کے خوف سے غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے وہ بھی عیسائی تھے۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کی تین صدیوں پر محیط لازوال قربانیوں کے بعد بالآخر ۳۰۰ عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی۔ آیت میں اسی غلبے کا ذکر ہے۔

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار جب گمراہ ہونے پر آئے تو انہوں نے شرک بھی بدترین ایجاد کیا۔ یعنی انہوں نے اپنے پیغمبر کو بربنائے عقیدت اللہ کا صُلبی بیٹا بنا ڈالا (نعوذ باللہ)۔ اس ضمن میں آج ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض نعت خواں حضرات حضور ﷺ سے عقیدت اور عشق و محبّت کے نام پر اتنا غلو کرتے ہیں کہ آپؐ کو اللہ کے برابر بٹھانے سے کم پر ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی حضور ﷺ کے لیے ’’اوتار‘‘ کا عقیدہ بھی گھڑ لیا ہے۔ عبرت کے لیے ملاحظہ ہوں یہ اشعار: ؎

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر ۔۔۔ اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰؐ ہو کر!

اور: ؎

(باقی صفحہ 74 پر)

دُعا اور عبادت کا ربط و تعلّق

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ (۱۹۸۶ء) میں ناظم آباد نمبر ۵ کراچی کی جامع مسجد میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے جو افتتاحی خطاب فرمایا تھا وہ ''عظمتِ صیام و قیامِ رمضانِ مبارک'' کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔ اس رمضان المبارک میں بانی محترمؒ نے ناظم آباد کراچی کی تین مختلف مساجد میں جمعہ کے خطابات بھی ارشاد فرمائے تھے' جو مئی ۱۹۸۸ء کے میثاق میں شائع ہوئے تھے۔ پیش نظر خطاب اس سلسلے کا دوسرا خطابِ جمعہ ہے' جو نظرِ ثانی اور مزید ایڈیٹنگ کے بعد مکرر شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

الحمد للّٰہ وکفٰی والصّلوٰۃ والسّلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلھم وخاتم النّبیّین محمد الامین وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ اجمعین ...

امّا بَعد فقد قال اللّٰہ تبارک وتعالٰی:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّھُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ (البقرۃ)

وقال اللّٰہ عزّوجل:

﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَھَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ ﴿۶۰﴾﴾ (المؤمن)

وقال النبی ﷺ : ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (رواہ الترمذی)

وقال ﷺ : ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (رواہ الترمذی)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوا قَوْلِیْ

سورۃ البقرۃ کے ۲۳ ویں رکوع میں روزے کا حکم بھی آیا ہے' اس کی حکمت کا بیان بھی ہے اور اس کے تفصیلی احکام بھی آئے ہیں۔ انہی کے ذیل میں یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے جس کی اوّلاً تلاوت کی گئی ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (انہیں بتا دیجیے کہ) مَیں قریب ہی ہوں''۔ کہیں دور نہیں ہوں۔ ﴿اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ''مَیں جواب دیتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں) ہر دُعا کرنے والے کی دُعا کا جب بھی وہ مجھے پکارے (جب بھی مجھ سے دُعا کرے)'' ﴿فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ﴾ ''تو چاہیے کہ وہ بھی میری پکار پر لبیک کہیں (یعنی میرے احکام کو مانیں اور تسلیم کریں)۔'' ﴿وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ﴾ ''اور مجھ پر پختہ ایمان اور یقین رکھیں'' ﴿لَعَلَّھُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ ''تاکہ وہ رشد و فوز سے ہمکنار ہوں۔''

بظاہر اس آیتِ مبارکہ میں نہ روزے کا ذکر ہے نہ رمضان کا' لیکن کسی بھی باشعور ہستی کے کلام میں ربط کا ہونا ضروری ہے اور غیر مربوط کلام ایک باشعور ہستی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس سے بڑھ کر باشعور اور حکیم ہستی کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ کلام ربط سے خالی ہو! جن لوگوں نے ربط و تعلقِ آیات پر زیادہ توجّہ صَرف نہیں کی' وہ یقیناً قرآن مجید کی حکمت و معرفت کے ایک بہت اہم پہلو سے محروم رہ گئے۔ بلاشبہ قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ پر علم و حکمت اور معرفت و عرفان کا ایک بیش قیمت موتی ہے۔ جیسے آپ کسی ہار میں موتیوں کو پروتے ہیں تو اس کے نظم و ترتیب سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے' اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید پر غور و فکر کے ضمن میں ضروری ہے کہ انسان دو باتوں کو ملحوظ رکھے۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ پر اپنی توجّہات کو اس طرح مرتکز کر دے جیسے کسی نہایت لطیف اور خفیف ترین شے کے مشاہدے کے لیے مائیکروسکوپ کو فوکس (focus) کر دیا جاتا

ہے۔ آیت کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا حق ادا کیا جائے اور ان کی تراکیب پر تدبّر و تفکّر کر کے انہیں خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اس کا سیاق و سباق ملاحظہ کیا جائے اور اس ربط و تعلق سے آیتِ زیرِ مطالعہ میں جو نئے معانی اور نئی معرفت کا سراغ ملتا ہے اسے تلاش کیا جائے۔

سورۃ البقرۃ کے ۲۳ویں رکوع کی پہلی آیت میں مجرد روزے کا حکم اور اس کی حکمت کا بیان ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ ”اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے“۔ دوسری آیت میں ابتدائی احکام ہیں۔ تیسری آیت میں رمضان المبارک کا ذکر ہے اور اس پورے مہینے کے روزوں کی فرضیت کا بیان ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ .....﴾ ”رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر، اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ .....“ اس آیت کے بعد یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے جو زیرِ مطالعہ ہے۔ پھر اس سے اگلی آیت میں روزے کے تفصیلی احکام آئے ہیں، جو اس رکوع کی طویل ترین آیت ہے۔ درمیان میں جو یہ موتی ٹکا ہوا ہے، اب ہم اپنی توجّہات اس پر مرتکز کرتے ہیں۔

قربِ الٰہی کا جذبہ فطری ہے!

پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس آیت مبارکہ کا اصل مضمون دُعا کی عظمت ہے۔ جب کسی انسان کے دل میں اللہ کی طرف توجّہ اور انابت پیدا ہو جائے اور اس کے دل میں اپنے رب سے تقرّب حاصل کرنے کا ایک جذبہ اُبھرے، تو نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے شخص کو سب سے پہلے تو یہ خوشخبری دیجیے کہ تمہارا ربّ کہیں دُور نہیں ہے۔ اس ربّ سے ہم کلام ہونے کے لیے کہیں جنگلوں میں جا کر دھونی رمانے، کہیں پہاڑوں کی کھوؤں میں جا کر ڈیرا لگانے یا کہیں برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر تپسیائیں کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب میں خدا کا جو بھی تصوّر رہا ہے، اسی کے ساتھ یہ نظریہ بھی رہا ہے کہ خدا سے قرب حاصل کرنے کے لیے آبادیوں کو چھوڑنا، گھر گرہستی سے ترکِ تعلق اور تجرد کی زندگی ضروری ہے۔ چنانچہ آبادیوں اور گھروں کی آسائشوں کو چھوڑو، کہیں جنگلوں میں جاؤ، کہیں غاروں اور کھوؤں میں خاص آسنوں کے ساتھ بیٹھ کر پرماتما سے لو لگاؤ، کہیں ہمالیہ کی کسی برفانی چوٹی پر جہاں سرد ہوائیں چل رہی ہوں، ننگے بدن بیٹھو یا کہیں کسی گڑھے میں اپنے آپ کو دفن کرو۔ یہ سو طرح کے جتن ہیں جو انسان اپنے تصوّرِ خدا کے مطابق اس سے قرب حاصل کرنے کے لیے کرتا رہا ہے۔ انسان اپنی دانست میں یہ ساری مشقّتیں کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے جھیلتا ہے اور وہ ہے اپنے تصوّرِ خدا کے مطابق اس کا قرب حاصل کرنا۔ یہ انسان کی ایک فطری اور طبعی خواہش ہے۔

خواہ وہ اپنے رب کو صحیح طور پر پہچان نہ پایا ہو اور اس کی توحید کا بھی اسے صحیح ادراک نہ ہو سکا ہو، لیکن فطرتِ انسانی میں اپنے پیدا کرنے والے سے قرب و تعلق قائم کرنے کا جذبہ طبعی اور فطری طور پر موجود ہے۔ جیسے انسان چاہے یہ جانتا نہ ہو کہ بھوک کیا شے ہے لیکن اسے اس کا احساس بہرحال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ احساس نوزائیدہ بچے کو بھی ہوتا ہے جو بھوک کی وجہ سے روتا ہے تو ماں اسے دودھ پلاتی ہے۔ یہ اصل میں اس کی جبلت اور فطرت ہے۔ چنانچہ جس طرح انسان میں اپنی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تقاضوں کا شعور اس کے اندر سے ابھرتا ہے، ایسے ہی ایک روحانی پیاس بھی انسان کے اندر سے اُبھرتی ہے۔ بہتوں میں یہ کم اُبھرتی ہے اور بہت سوں میں زیادہ اُبھرتی ہے۔ بہت سے لوگ اس دنیا میں اتنے مشغول ہو جاتے ہیں اور اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین و تکمیل میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی روح کی پکار سنائی نہیں دیتی، یا وہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ تاہم کوئی انسان، انسان ہونے کے ناطے اس سے بالکل محروم نہیں ہے۔

یہ پیاس اندر سے ابھرتی ہے جو لوگوں کو جنگلوں تک میں لے جاتی ہے۔ یہی پیاس تھی جس نے گوتم بدھ کو اپنے محل سے نکال کر نہ معلوم کن کن جنگلوں کی خاک چھنوائی اور

اسے کن کن منیوں اور رشیوں کے پاس لے گئی اور اس سے کس کس کی جوتیاں سیدھی کرائیں۔ اس نے یہ سب کس لیے کیا؟ وہ کپل وستو کا راج کمار تھا۔ محل میں اسے تمام آسائشیں اور ہر طرح کا آرام حاصل تھا لیکن اس کے دل میں مکتی کے حصول اور دکھ سکھ کی حقیقت جاننے اور اپنے تصوّر کے مطابق اپنے ایشور کا گیان دھیان حاصل کرنے کا ایک جذبہ اُبھرا۔ پھر وہ اپنے محل‘ اپنی جوان بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ درحقیقت یہ فطرت کی ایک پیاس تھی جس نے اس سے یہ سب کچھ چھڑوا دیا۔ یہ فطرت کی پکار ہی تھی جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایران سے نکال کر شام کے مختلف علاقوں میں لے گئی‘ جہاں وہ مختلف راہبوں کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے دل میں اپنے رب کی معرفت کی ایک پیاس تھی۔ جس کے دل میں یہ ایک سچی پیاس کی حیثیت سے اُبھر آئے تو اسے اس وقت تک چین نہیں آ سکتا جب تک کہ اس کی اس پیاس کی سیری کا کوئی بندوبست نہ ہو جائے۔

صیام وقیام: قربِ الٰہی کے جذبے کو اُبھارنے کا ذریعہ

اب اس آیت مبارکہ کا رمضان اور اس کے روزوں کے حکم وفرضیت سے جو ربط و تعلق ہے‘ اسے سمجھ لیجیے۔ روزے کی حکمت بیان فرمائی گئی: ’’لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ‘‘ اور رمضان میں ان کی فرضیت کی دوسری حکمت بیان فرمائی ’’لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ‘‘۔ ہمارے اندر جو ملکوتی روح ہے اور اس کی جو پیاس ہے‘ وہ ہمارے جسمانی وحیوانی اور جبلّی تقاضوں تلے دبی رہتی ہے۔ ہم کاروبارِ دنیا میں منہمک رہتے ہیں‘ دنیا کی آسائشوں اور کام و دہن کی لذتوں میں مستغرق رہتے ہیں۔ بھوک لگی تو کھانا کھا لیا اور پیاس لگی تو پانی پی لیا۔ جنسی جذبے نے جوش مارا تو جائز طریقہ سے اس کی تسکین کر لی۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے میں انسان اس قدر منہمک رہتا ہے کہ روح کی پیاس اسے محسوس ہی نہیں ہوتی۔ رمضان کے روزوں کا پروگرام درحقیقت یہ ہے کہ پورے مہینے کے لیے معمولات کو الٹ دیا گیا ہے۔ اب دن میں بھوک اور پیاس برداشت کرو‘ جنسی خواہش کی تسکین پر قدغن لگاؤ۔ رات کو جبکہ آرام واستراحت کا شدید ترین داعیہ اُبھرتا ہے‘ حکم ہوتا ہے کہ قرآن

کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نفس کے جتنے تقاضے ہیں‘ ان کی مخالفت ہو رہی ہے۔

دن بھر بھوک‘ پیاس اور جنسی تقاضے کی مخالفتیں آپ نے برداشت کیں‘ اب جو یہ بند کھلا اور آپ نے اپنے پیٹ کو بھرا تو حکم ہو گیا کہ کھڑے ہو جاؤ اور صلوٰۃ العشاء کے بعد صلوٰۃ التراویح ادا کرو‘ جس کا اہلِ سُنّت کے تین فقہی مسالک میں بیس رکعات کا نصاب مقرر ہے۔ یہ کم سے کم نصاب ہے‘ ورنہ مطلوب یہ ہے کہ رمضان کی راتوں کا اکثر و بیشتر حصّہ قرآن مجید کے ساتھ جاگ کر گزارا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان تو یہ تھی کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴﴾

’’اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔ (یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔ یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں‘ اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جایئے۔‘‘

تو اس کی کچھ مشابہت اور اس کا کوئی عکس تو ہمارے اندر رمضان المبارک کی راتوں میں آ جائے۔ بہرحال‘ نمازِ عشاء کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی اضافی مشقّت بھی اُس وقت ہے جب طبیعت پر کسل کا شدید ترین غلبہ طاری ہوتا ہے۔ یہ سب کیا ہے! اسے مَیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ یہ reversal ہے۔ گیارہ مہینے جو عمل (process) جاری رہتا ہے اس میں ریورس گیئر ہے جو رمضان میں اس طور پر لگایا گیا ہے کہ اپنے نفس اور کام و دہن کے تقاضوں کو دباؤ۔ جب یہ دبتے ہیں تو اندر سے روح کی پیاس ابھرتی ہے۔ جب یہ ابھرے تو پہلی خوشخبری دی گئی کہ جان لو کہ تمہارا ربّ تمہارے بالکل قریب ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ﴾

جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے‘ وہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے لیے وہاں کیسی کشمکش ہوئی۔ انسان نے اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے اور مطلق العنان بادشاہوں کے چنگل اور جاگیرداروں کے شکنجے سے نجات پانے کے لیے وہاں جو جِدّ و جُہد

کی ہے اور پاپائیت کے منحوس اور بدترین نظام کا جو جُوا اُن کے کاندھوں پر رکھا ہوا تھا‘ اس سے رستگاری پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی ہیں ان کا تاریخِ انسانی کے اہم ترین اور ناقابل فراموش واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ وہ نشاناتِ راہ ہیں جن پر چل کر حقوقِ انسانی کا منشور وجود میں آیا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت مبارکہ کی رو سے انسانی حقوق کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) یہ ہے کہ انسان کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ تمہارا ربّ تم سے دُور نہیں ہے‘ بلکہ نقشہ یہ ہے کہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی!

یہ ہے بندے کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ۔ رب تو ہر دم‘ ہر آن مائل بہ کرم رہتا ہے۔ وہ تو ہم سے غافل نہیں ہے۔ ہم ہی اس سے غافل اور غائب ہو جاتے ہیں۔ عربی کا یہ شعر مَیں نے دسویں جماعت کے کورس میں پڑھا تھا کہ ؎

اَغِیْبُ وَ ذُو اللَّطَائِفِ لَا یَغِیْبُ
وَاَرْجُوْہُ رَجَاءً لَا یَخِیْبُ!

مَیں غائب ہو جاتا ہوں‘ وہ جو صاحبِ اَلطاف وکرم ہے وہ تو غائب نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر آن اور ہر جگہ موجود ہے۔ وہ تو منتظر رہتا ہے کہ میرا بندہ میری طرف متوجّہ ہو۔ یہ تو ہم ہیں جو اُس کی طرف رُخ ہی نہیں کرتے۔ ہم نے تو اس سے پیٹھ موڑی ہوئی ہے۔ ہم نے اس دنیا کو اپنا محبوب اور مطلوب بنا لیا ہے اور دولت کے پجاری بن گئے ہیں۔ ہم اپنے نفس کی غلامی میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم کہاں اُس ذُواللّطائف ہستی کی طرف رخ کرتے ہیں!

حدیثِ قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ میرا بندہ اگر میری طرف چل کر آتا ہے تو مَیں اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو مَیں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو مَیں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ میرا بندہ اگر میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو مَیں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں‘ یعنی ملائکہ مقرّبین کی محفل میں اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کا ذکر فرماتے

ہیں۔ علّامہ اقبال نے اسی کی ترجمانی ’’جوابِ شکوہ‘‘ میں اس طرح کی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں!

لیکن اگر بندے میں یہ پیاس ابھر آئے تو جب چاہے‘ جہاں چاہے اللہ سے ہم کلام ہو جائے جہاں کوئی حاجب نہیں‘ کوئی دربان نہیں۔ اس کی بھی علّامہ اقبال نے بہترین تعبیر کی ہے ؎

کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

ربّ اور بندے کے درمیان کوئی حائل نہیں!

یہ تو درحقیقت ہماری غفلت ہے‘ ہماری نادانی ہے۔ کچھ ہوشیار لوگوں کی چالاکی ہے کہ وہ استھان بنا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اگر تم کو اپنے رب سے ہم کلام ہونا ہے تو پہلے یہاں نذر ونیاز پیش کرو‘ ہماری مٹھیاں گرم کرو۔ ہم اس کے دربار کے حاجب اور دربان ہیں اور ہم جس بزرگ کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے ہیں‘ ان بزرگ کی اللہ کے یہاں بڑی رسائی ہے۔ تمہاری درخواست اللہ کے یہاں ان کے ذریعہ سے پہنچ سکے گی اور ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں۔ پہلے ہمیں خوش کرو‘ ہماری مُٹھی گرم کرو تو تمہارا کام بنے۔

دنیا میں ساری لوٹ کھسوٹ اور جابرانہ استحصال صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں ہوتا‘ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا سب سے بڑا استحصال (exploitation) مذہب کے میدان میں ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ التوبہ میں بالکل واشگاف کر دیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۳۴) ’’اے اہلِ ایمان! اکثر علماء ومشائخ کا حال یہ ہے کہ لوگوں کے مال باطل طور طریقوں سے کھا جاتے ہیں اور اللہ کی (توحید کی) راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔‘‘ مذہب کے نام پر باطل اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کے اموال ہڑپ کرنے کے لیے اس طرح کے نظام

بنائے گئے ہیں کہ یہ دیوی دیوتا ہیں‘ یہ ان کے مندر استھان ہیں‘ یہ ان کے بُت ہیں اور یہ ان کے پروہت ہیں‘ یہ ان کے پجاری ہیں‘ یہ پنڈت ہیں۔ کوئی پیر صاحب ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کی فلاں فلاں بزرگوں سے نسبت ہے۔ کہیں پادری یا پوپ صاحب ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کے بیٹے مسیحؑ کے چہیتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمت کرو گے‘ ان کو راضی رکھو گے‘ ان کی ناز برداریاں اٹھاؤ گے تب ہی ایشور تک رسائی ہوگی۔ ان کو خوش کرو گے تب ہی اللہ خوش ہوگا۔ ان کو راضی رکھو گے تب ''ابن اللہ'' تمہارے کام آئیں گے۔

مَیں حیران ہوا کرتا ہوں کہ مذہب کے نام پر جو استحصالی نظام ہیں وہاں یہ حرف ''پ'' ہی آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ حتیٰ کہ پادری کے لیے جو انگریزی لفظ priest ہے وہاں بھی یہ ''پ'' موجود ہے۔ اسی ''پ'' کی گردان آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ عربی زبان میں ''پ'' ہے ہی نہیں۔ اس نے تو اس ''پ'' کی ایسی جڑ کاٹی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو دین ہمیں دے کر تشریف لے گئے ہیں‘ اُس نے اس تصوّر کی بالکلیہ نفی کر دی۔

اب آیت کی طرف پھر رجوع کیجیے۔ فرمایا: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (بتا دیجیے کہ) مَیں بہت قریب ہوں۔'' یعنی جب بندے میں اپنے رب سے ہم کلام ہونے کی سچی اور حقیقی پیاس پیدا ہوتی ہے اور اس کے قلب کی گہرائی سے واقعتاً اپنے رب سے مناجات کرنے اور اپنی غفلت پر پشیمان ہو کر اس سے توبہ و استغفار کرنے کا جذبہ اُبھرتا ہے تو وہ اپنے بندے سے دور نہیں‘ قریب ہی ہوتا ہے۔ اُس کا در اُس کی طرف رجوع کرنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔ اسلام میں توبہ کا دروازہ کس درجہ کھلا رکھا گیا ہے‘ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: ((اِنَّ اللّٰهَ یَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ)) (رواہ الترمذی) ''یقیناً اللہ تعالیٰ اُس وقت تک بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک موت کا گھنگھرو نہ بولنے لگے۔'' یعنی جب تک عالَمِ نزع

طاری نہ ہو جائے‘ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اگرچہ کسی کے کوہِ اُحد جتنے گناہ ہوں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ نے اسی مفہوم کی یوں ترجمانی کی ہے:

باز آ‘ باز آ‘ ہر آنچہ ہستی باز آ!
گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ!
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

''واپس آ جاؤ‘ واپس آ جاؤ! تم جو بھی ہو‘ واپس پلٹ آؤ! تم چاہے کافر ہو‘ مجوسی ہو یا بُت پرست ہو‘ واپس پلٹ آؤ! ہماری یہ بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اگر سو بار توبہ توڑ چکے ہو تو بھی واپس پلٹ آؤ!''

آج اگر خلوص و اخلاص کے ساتھ پھر متوجّہ ہو گے تو یہ بارگاہ وہ ہے جو کبھی بند نہیں ہوتی۔ اس پر کوئی حاجب اور دربان نہیں۔ سچی پشیمانی اور خلوص کے ساتھ رجوع کرو۔ اس ارادہ کے ساتھ اللہ سے توبہ کرو کہ مَیں شرم سار ہوں‘ پشیمان ہوں‘ تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ اے اللہ! اب تک جو زندگی غفلت میں گزری ہے‘ گناہوں میں بسر ہوئی ہے اسے تُو معاف فرما دے۔ اب مَیں ازسرِنو تجھ سے عہد کر رہا ہوں‘ پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ‘ پورے عزم کے ساتھ کہ اب تیرے حکم کے خلاف نہیں چلوں گا اور تیری مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گا۔ تو نے جو کرنے کو فرمایا ہے وہ کروں گا اور جس سے بچنے کا حکم دیا ہے اس سے بچوں گا۔ تجھ پر ایمان پختہ رکھوں گا۔

ربّ اور بندے کا تعلق دوطرفہ ہے!

چنانچہ اس آیت کا اگلا حصّہ یہی ہے جو اس وقت مَیں نے عرض کیا ہے: ﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ ''انہیں بھی تو چاہیے کہ میرا کہنا مانیں۔'' یک طرفہ معاملہ نہیں چلے گا کہ تم مجھ سے اپنی منوانا چاہو اور میری مانو نہیں۔ مجھے اپنی احتیاجیں سنانا چاہو اور میری بات سنو ہی نہیں۔ مجھ سے تم چاہو کہ مَیں تمہاری مدد کروں جبکہ تم میرے دشمنوں کی مدد کرو اور ان کے ساتھ ساز باز کرو۔ تم میرے باغیوں کے ساتھ وفاداری کا رشتہ استوار کرو

اور میرے نافرمانوں کے نقشِ قدم کو اپنے لیے نشانِ راہ بناؤ۔ یہ نہیں ہوگا' بلکہ دوطرفہ معاملہ ہوگا: ﴿فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۲) ''تم مجھے یاد رکھو' مَیں تمہیں یاد رکھوں گا۔'' ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾ (محمد) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔'' اللہ کی مدد کیا ہے؟ یہ دراصل اُس کے دین کی خدمت ہے۔ اس کے دین کی اقامت کے لیے تن من دھن لگانا! اللہ ہم سے روزی نہیں چاہتا۔ سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے نوعِ انسان سے فرمایا گیا: ﴿لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ﴾ (آیت ۱۳۲) ''(اے نبی ﷺ!) ہم آپ سے روزی طلب نہیں کرتے' بلکہ ہم آپ کو رزق دیتے ہیں۔'' سورۃ الذاریات میں یہ اٹل بات فرما دی: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ ''اور مَیں نے جنّوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اسی لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝۵۷﴾ ''مَیں ان (جن وانس) سے رزق کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ اس کا خواہاں ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں' پلائیں'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝۵۸﴾ ''تحقیق اللہ تو خود ہی رزّاق ہے (روزی رساں ہے) بڑی قوت والا ہے' بڑا زبردست ہے۔'' ہاں اُس کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ۔ اس کو سربلند کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگاؤ تو پھر جو دُعا کرو گے اسے ہم قبول کریں گے۔ تمہاری جو پکار ہوگی اس پر ہمیں موجود پاؤ گے۔

ایک حدیث شریف میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں: ((اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ اَمَامَكَ)) (رواہ احمد) ''تم اللہ کو یاد کرو تو اُسے اپنے سامنے موجود پاؤ گے۔'' وہ کہیں دور ہے ہی نہیں۔ سورۂ قٓ میں فرمایا: ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶﴾ ''ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں۔'' سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ﴾ (آیت ۴) ''وہ (اللہ) تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو۔'' یہ تو تمہاری بے التفاتی اور عدم توجّہی ہے کہ ہماری طرف رخ نہیں کرتے۔ تمہارے دل کے سنگھاسن پر ہماری محبّت کے

بجائے کسی اور کی محبّت براجمان ہے۔ تمہارے دل پر تو حُبِّ جاہ' حُبِّ شہرت اور زر' زمین اور زن کی محبتوں نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ اگر دل کو ان محبتوں سے پاک کر کے میری محبّت سے آباد کر لو تو جہاں تم ہو' وہاں مَیں ہوں۔ حدیث قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ پھر ایک مقام وہ بھی آتا ہے کہ مَیں اپنے بندے کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے' مَیں اپنے بندے کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے' مَیں اپنے بندے کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' مَیں اپنے بندے کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔

ربّ کی پکار پر لبیک کہو!

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (آیت ۱۸۶) ''مَیں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔'' اجابت اور استجابت کے معنی قبول کرنے کے بھی ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں آپ کو یہ آیت ملے گی: ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝۴۷﴾ ''اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو' اس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آن دھمکے جسے لوٹایا نہ جا سکے گا۔ اس دن نہ کوئی تمہارا پشت پناہ ہوگا اور نہ ہی تمہاری طرف سے کوئی انکار کرنے والا ہوگا۔'' اس آیت مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ استجابت کے معنی ''قبول کرنا'' ہیں۔ ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ﴾ ''لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر' مانو اپنے رب کے مطالبہ کو۔'' سورۃ البقرۃ کی زیر گفتگو آیت میں فرمایا: ﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ ''ان کو بھی تو چاہیے کہ میری پکار کو سنیں' میری بات کو قبول کریں۔''

ہمارے رب کی پکار کیا ہے؟ اس کے ضمن میں تین چیزیں خاص طور پر گن لیجیے۔ پہلی پکار ہے: ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ (البقرۃ:۲۱) ''اپنے رب کی بندگی کرو۔'' ہمہ تن اللہ کے بندے بن جاؤ اور پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاؤ' یعنی: ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' اسلام میں جزوی داخلہ اللہ کو قبول نہیں ہے۔ آنا ہے تو پورے آؤ' ورنہ دور ہو جاؤ۔ ہماری

کوئی احتیاج نہیں ہے‘ احتیاج تمہاری ہے۔

دوسری پکار یہ ہے کہ ہماری وہ امانت تمہارے پاس ہے جو ہم نے پہلے عطا کی تھی اپنے محبوب بندے محمد ﷺ کو۔ انہوںؐ نے اس امانت کا حق ادا کر دیا‘ اسے تم تک پہنچا دیا۔ انہوںؐ نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے گواہی لے گئے: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) سوا لاکھ کے مجمع نے حجۃ الوداع میں اقرار کیا: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ! ’’بے شک (حضور ﷺ)! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا فرما دیا‘ آپؐ نے حقِ امانت ادا فرما دیا اور آپؐ نے حقِ نصیحت ادا فرما دیا۔‘‘ یہ گواہی لے کر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))۔ اب یہ ذمہ داری میرے کاندھوں سے اتر کر تمہارے کاندھوں پر آ گئی ہے‘ لہٰذا اب جو یہاں موجود ہیں پہنچائیں ان کو جو موجود نہیں ہیں! اس لیے کہ میری رسالت صرف تمہارے لیے نہیں ہے بلکہ پوری دنیا اور پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸) ’’(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر‘‘۔ لہٰذا دوسری پکار یہ ہوئی کہ توحید کی خود بھی گواہی دو اور اس کی دعوت کو عام کرو اور قرآن کے پیغام کو پوری نوعِ بشر تک پہنچاؤ۔

تیسری پکار یہ ہے کہ میرے دین کو قائم کرو‘ میرے کلمہ کو سربلند کرو۔ ﴿وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝۱۱۱﴾ (بنی اسرائیل) اُس کی بڑائی کرو‘ اُس کی بڑائی قائم کرو جیسے کہ بڑائی کی جاتی اور قائم کی جاتی ہے۔ وہ نظام بالفعل قائم اور نافذ کرو جس میں ’Supreme Authority‘ صرف اللہ کو تسلیم کیا جائے۔ اُسی کا دین قائم اور غالب ہو جائے اور اس سے اوپر کوئی نہ رہے۔ تیسری پکار یہ ہے کہ اس کام کے لیے اپنے آپ کو لگاؤ‘ کھپاؤ اور اپنی صلاحیتوں کو صَرف کرو۔

یہی بات ہے جو آیتِ زیرِ مطالعہ میں فرمائی جا رہی ہے: ﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ ’’انہیں بھی چاہیے کہ میری پکار پر لبیک کہیں۔‘‘ ﴿وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ ’’اور مجھ پر ایمان

رکھیں‘‘۔ یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے جو پونجی درکار ہے‘ وہ ایمان ہے۔ جس شخص کو اللہ پر ایمان و یقین اور توکّل ہے اور اس کی مدد و نصرت پر بھروسا ہے وہی اللہ کی پکار پر لبیک کہہ سکے گا اور اس کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اس آیت مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶﴾ ’’تاکہ لوگ رشد و ہدایت کی راہ پر آ جائیں۔‘‘ یعنی روزہ‘ اللہ کی تکبیر‘ اس کا شکر‘ اس سے تعلق‘ اس سے دُعا اور مناجات‘ یہ تمام امور وہ ہیں کہ اگر ایک بندۂ مؤمن ان کا خلوص و اخلاص کے ساتھ اہتمام کرے تو وہ رشد و ہدایت اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

یہ ہے وہ آیت مبارکہ جس کے ذریعہ سے ہمارے سامنے یہ بات آ جاتی ہے کہ دُعا کا روزے اور رمضان کے دوگونہ پروگرام سے کیا تعلق ہے! مَیں رمضان کو اس لیے شامل کر رہا ہوں کہ روزہ تو دن کا ہے اور رات کو درحقیقت رمضان کا خصوصی پروگرام ہے۔ رمضان کیا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ’’رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے‘‘۔ چنانچہ یہ رات کی تراویح‘ یہ رات کا قیام‘ یہ قرآن مجید کا سننا‘ سنانا اور اس کا سمجھنا‘ یہ اصل میں رمضان کا حق ہے۔ روزے تو خواہ کسی مہینے کے فرض ہو جاتے‘ ان کی برکات تو وہی رہتیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دو آتشہ پروگرام بنایا کہ دن کا روزہ ہو اور رات کا قیام تاکہ دونوں کا نتیجہ یہ نکلے کہ تمہارے اندر اپنے رب کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کی پیاس اُبھرے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت اور اس کی معرفت کا ایک جذبہ دل میں جوش مارے۔ جب یہ کیفیت ہو جائے تو اے نبی ﷺ! ان کو میری طرف سے خوشخبری دیجیے کہ مَیں قریب ہی ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے۔ پس یہ بھی میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر پختہ ایمان رکھیں تاکہ رشد و ہدایت سے ہمکنار ہوں۔

دعا اور عبادت مترادف ہیں!

اس آیت مبارکہ کی اہمیت مَیں مزید چند آیات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سورۃ المؤمن کی ایک آیت عام طور پر جمعہ میں خطبہ اوّل کے اختتام پر پڑھی جاتی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾﴾

یہ اس اعتبار سے بڑی جامع آیت ہے کہ اس میں دُعا اور عبادت کا ہم معنی اور مترادف ہونا بالکل واضح اور ظاہر و باہر ہو جاتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے دو حصے ہیں اور ہمیں ان دونوں حصوں کے مابین ربط و تعلق کو جاننا ہوگا۔ پہلے حصے میں فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ﴾ ''اور تمہارے رب نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے پکارو مَیں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔'' ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اس کی بڑی پیاری وضاحت فرمائی ہے: ((اِنَّهٗ مَن لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ)) (رواہ الترمذی) ''حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اُس سے ناراض ہو جاتا ہے''۔ دنیا میں اگر کسی سے کچھ مانگا جائے تو بالعموم انسان کو ناگوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے سخی کا حال بھی یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک سوال کیا' اس نے پورا کر دیا' لیکن اگر سوال کا سلسلہ دراز ہوا تو ایک حد تک آ کر اس کے ماتھے پر بھی بل پڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس اللہ ربّ العزت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے اور اُس سے جتنا مانگا جائے اتنا ہی وہ خوش ہوتا ہے' اور جتنا مانگا جائے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بے حساب دیتا ہے۔ آپ اللہ سے دُعا کرتے ہیں' اس سے مانگتے ہیں تو اس لیے کہ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ وہ آپ کی دُعا سنتا ہے' آپ کی تکلیف کو رفع کر سکتا ہے' آپ کی احتیاج کو پورا کر سکتا ہے۔ اس طرح آپ کی طرف سے اللہ کے سمیع ہونے اور اس کے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہونے کے یقین کا اقرار و اظہار ہوتا ہے۔ یہی چیزیں درحقیقت ایمان کا لبِ لباب ہیں۔

اگر ہماری شخصیتیں مسخ ہو گئی ہوں اور ہمارے اخلاقی تصوّر میں فساد پیدا ہو گیا ہو تو یہ بات دوسری ہے' ورنہ آپ سوچیے کہ اگر کوئی شریف شخص کسی سے کوئی درخواست کرے کہ میرا یہ کام کر دیجیے اور وہ اس کام کو کر دے تو کیا وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ اگر اس نے میری کوئی تکلیف رفع کی ہے یا میری کوئی ضرورت پوری کی ہے اور آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تو مجھ پر بھی اس کا کوئی حق قائم ہو گیا ہے! ہر شریف اور بامروّت انسان کا یہ ردِّعمل

لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اللہ سے دُعا کریں گے' اس کی استعانت کے طالب ہوں گے تو اگر آپ کی شخصیت مسخ نہ ہوئی ہو تو خود بخود آپ کے دل میں یہ جذبہ اُبھرے گا کہ آپ اپنے محسن کے شکر گزار بنیں۔ چنانچہ دُعا کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ آپ میں عبدیت پیدا ہو۔ آپ یہ سمجھیں کہ آپ پر اللہ کا یہ حق ہے کہ آپ اس کا ہر حکم تسلیم کریں۔ چونکہ آپ اس سے دُعا کر رہے ہیں' اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدعا کر رہے ہیں لہٰذا اس کا معقول' فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کی بندگی اختیار کریں۔ چنانچہ آیت مبارکہ کے اس حصّہ کا دوسرے حصّہ سے نہایت گہرا ربط و تعلق قائم ہو گیا ہے۔

اس ربط کی تفہیم کے لیے ہم پوری آیت مبارکہ کا دوبارہ مطالعہ کرتے ہیں:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾﴾ ''اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھے پکارو (مجھ سے دُعا کرو) مَیں تمہاری دُعاؤں کو قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (یعنی تکبّر کی بنا پر میری بندگی سے مُنہ موڑتے ہیں) یہی لوگ عنقریب جہنّم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔'' آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دُعا اور عبادت کس طرح ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دُعا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے اور مناجات کرنے کے مظہر کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ آپ اُسے حاضر و ناظر تسلیم کرتے ہیں۔ اُسے القَدِیر سمجھتے ہیں' اُسے السَّمِیع جانتے ہیں' اُسے مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں' اُسے الرَّحْمٰن الرَّحِیْم تسلیم کرتے ہیں' اُسے فریادرس اور عادل و منصف سمجھتے ہیں۔ علّامہ اقبال کے تیسرے لیکچر کا عنوان ہے:

''The Conception of God and the Meaning of Prayer''

ان کے لیکچرز کی زبان خاصی مشکل ہے لیکن یہ لیکچر نسبتاً آسان ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''دُعا کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہماری انائے صغیر اُس انائے کبیر کے روبرو ہو جائے' ہم اللہ سے

خطاب کر رہے ہوں۔'' ایک ہے غائبانہ ذکر یا passive ذکر' جیسے ہم سبحان اللہ' الحمد للہ اور اللہ اکبر کا ورد کرتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے لیکن اس میں اس سے خطاب نہیں ہے۔ اس میں مکالمہ اور مخاطبہ والی بات نہیں ہے۔ البتہ جب آپ کہتے ہیں: ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ ''اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے'' تو اس میں اللہ سے خطاب ہے۔ یہاں ہماری انائے صغیر (finite ego) روبرو آجاتی ہے انائے کبیر (Infinite Ego) کے۔ یہ جو بالمشافہہ بات ہو رہی ہے' یہ درحقیقت فکر کی معراج (climax) ہے۔ یہ active ذکر ہے۔ اس میں اللہ کو مخاطب کر کے اس کو یاد کیا جا رہا ہے۔

اللہ سے کیا مانگا جائے؟

دُعا کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے رب سے کن چیزوں کی دُعا کرنی چاہیے۔ اختصار سے عرض کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں ایک طرف تو نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہاں تک تلقین فرمائی ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی درکار ہو تو اللہ سے مانگو۔ یعنی یہ کہ حقیر سے حقیر شے بھی اللہ ہی سے مانگو اور بڑی سے بڑی شے بھی اُسی سے مانگو۔ اس طرح گویا تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ کسی اور سے کچھ نہ مانگو۔ تمہارے لیے اتنی بڑی بارگاہ کھلی ہوئی ہے' یہاں سے کیوں نہیں مانگتے؟ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے مابین ہیں۔ وہ تمہاری ضرورت جس کے ذریعے سے چاہے گا' پوری کر دے گا۔ تم کیوں اپنے جیسے انسان کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اپنی انسانیت کو رسوا کرتے ہو؟ آپ نے کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلایا تو گویا اپنی عزّتِ نفس کا دھیلا کر دیا۔ لہٰذا جو کچھ بھی مانگنا ہو' اللہ سے مانگو۔ کوئی چیز اس کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں ہے۔

سورۃ الکہف میں دو یتیم بچوں کے مکان کی دیوار کا ذکر آیا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے گر رہی تھی۔ ان کے والدین نیکوکار تھے۔ انہوں نے کچھ پونجی اپنے یتیم بچوں کے لیے اس دیوار کے نیچے گاڑی ہوئی تھی تاکہ بچے جب بڑے ہو جائیں تو ان کے کام آئے۔ وہ دیوار گرا چاہتی تھی کہ اس کو بچانے کے لیے حضرت خضر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں

اللہ کے احکام کی تنفیذ کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے محافظت کرنے والے نہ معلوم کہاں کہاں موجود ہیں' ہم تو جانتے تک نہیں۔ ﴿وَمَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ ؕ﴾ (المدثر:۳۱) ''تمہارے رب کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا سوائے اُس کے۔'' وہ جس کے ذریعے سے چاہے گا' تمہاری ضرورت کو پورا کرا دے گا۔ لہٰذا کسی سے کچھ نہ مانگو اور جو کچھ مانگنا ہے اُسی سے مانگو۔

جیسے معرفت اور ہدایت کے مختلف درجے ہیں: ﴿لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾﴾ (الانشقاق) ''البتہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی۔'' یہ تو ایک ایسا مسلسل عمل ہے کہ آپ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج مجھے کُل ہدایت حاصل ہو گئی' اسی طرح دُعا کے بھی درجات ہیں۔ دُعا کے ضمن میں بلند ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ سے کچھ نہ مانگو سوائے ہدایت اور استقامت کے۔ دُنیا کی کوئی شے اللہ سے نہ مانگو' اس لیے کہ تمہیں کیا پتہ کہ جو کچھ تم اللہ سے مانگ رہے ہو' وہ حقیقت میں تمہارے لیے خیر ہے یا شر ہے۔ وہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾﴾ (البقرۃ) یعنی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور تم اللہ سے اسے اپنے سے دور کر دینے کی دُعا کرو' حالانکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور اس کے حصول کے لیے اللہ کے حضور گڑگڑا کر اور ماتھا رگڑ کر دُعا کرتے رہو اور حقیقت میں وہی چیز تمہارے لیے موجبِ شر ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَیَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالۡخَیۡرِ ؕ وَکَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ﴿۱۱﴾﴾ ''اور انسان خیر مانگتے مانگتے اپنے لیے شر مانگ بیٹھتا ہے' چونکہ انسان جلد باز ہے۔'' انسان حقیقت کو نہیں دیکھتا جبکہ اللہ تعالیٰ حقیقت کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا اس سے مانگنے کی اصل چیز ہے ہدایت۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ''اے اللہ' اے ہمارے رب! ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرما۔''

((اَللّٰھُمَّ اھۡدِنَا فِیۡمَنۡ ھَدَیۡتَ' وَعَافِنَا فِیۡمَنۡ عَافَیۡتَ' وَتَوَلَّنَا

فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ، وَبَارِکْ لَنَا فِیْمَا اَعْطَیْتَ، وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَیْتَ، فَاِنَّکَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْکَ، اِنَّہٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ، وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ، تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ، نَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ)) (۱)

''اے اللہ! تُو ہماری رہبری فرما ان لوگوں میں جن کی تُو نے رہبری کی ہے، اور ہمیں عافیت دے ان لوگوں میں جن کو تُو نے عافیت دی ہے، اور ہمیں دوست بنا لے ان لوگوں میں جن کو تُو نے دوست بنالیا ہے، اور ہمیں برکت دے اس چیز میں جو تُو نے ہمیں عطا کی ہے، اور ہمیں ہر اُس برائی سے بچا لے جو تُو نے مقدر کر رکھی ہے، کیونکہ تُو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کا تُو دوست بن جائے وہ ذلیل نہیں ہوسکتا اور جس سے تُو دشمنی کرے وہ معزّز نہیں ہوسکتا۔ اے ہمارے رب! تُو برکت والا ہے اور بلند و برتر ہے۔ ہم تجھ سے مغفرت چاہتے ہیں اور ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔''

پھر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کی جائے:

((اَللّٰھُمَّ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ، وَیَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ))

''اے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر جمائے رکھنا۔ اور اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔'' (آمین!)

پھر اللہ ربّ العزت سے ہدایت میں افزونی اور علم میں اضافہ کی دُعا کیجیے۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ سے فرماتا ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) کہا کیجیے کہ اے میرے رب، میرے علم میں اضافہ فرما!'' اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دُعا کیجیے۔ نماز میں سلام پھیرنے کے بعد حضور ﷺ جو دُعائیں مانگا کرتے تھے، اس میں یہ دُعا بھی ہوتی تھی: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ یہ دُعا نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو صلوٰۃ الوتر میں پڑھنے کی خاص طور پر تلقین فرمائی تھی۔ (بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

نَّافِعًا وَّرِزْقًا طَیِّبًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا)) ''اے اللہ! مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں نفع دینے والے علم اور پاک اور حلال روزی اور مقبول ہونے والے عمل کا۔'' اور اللہ سے مانگنے کی چیز ہے فہم و فراست۔ جیسے روایات میں ایک دُعا منقول ہے: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ فی الواقع وہ ہیں۔'' ظاہر تو سب ہی دیکھ رہے ہیں لیکن مجھے ہر شے کی اصل حقیقت پر مطلع فرما! اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

تو اللہ سے وہ نظر مانگیے جو اشیاء کی حقیقت تک پہنچے۔ اس دُعا کو حرزِ جان بنائیے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ﴿۸﴾﴾ (آل عمران)

''اے رب ہمارے! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا مت کر دینا اس کے بعد کہ تُو ہمیں ہدایت دے چکا اور ہم کو اپنے خاص خزانۂ فضل سے رحمت عنایت فرما۔ بے شک تُو ہی ہے سب کچھ دینے والا۔''

اب ایک راز کی بات سمجھ لیجیے۔ انسان معرفتِ الٰہی میں جتنا بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی اس کی دُعا کا دائرہ محدود ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنی طلب کو ایک نکتے پر مرکوز کرتا چلا جائے گا۔ یعنی یہ کہ اللہ سے کیا دولت مانگے، کیا اولاد مانگے، کیا دنیا کی کوئی چیز مانگے! ہمیں کیا پتہ کہ وہ ہمارے حق میں خیر ہے یا شر!

دُعا کے باب میں اوّلیت پر تو وہ دُعا رہ جائے گی جس کا نام دُعائے استخارہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کہنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہ دُعا ایسے سکھائی اور تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے اور تلقین فرماتے تھے۔ وہ دُعا یہ ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ، فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْہُ لِیْ وَیَسِّرْہُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْہِ ، وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْہُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْہُ ، وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِہٖ)) (رواہ البخاری)

''اے اللہ! مَیں تیرے علم کے ذریعہ سے بھلائی مانگتا ہوں اور تیری قدرت کے ذریعہ سے قدرت چاہتا ہوں۔ اور مانگتا ہوں تیرے فضل عظیم سے۔ کیونکہ بالیقین تُو ہی قادر ہے، مَیں قادر نہیں ہوں اور تُو ہی جانتا ہے، مَیں نہیں جانتا۔ اور تُو ہی علّام الغیوب ہے۔ اے میرے اللہ! اگر تُو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین، میری معاش اور انجام کار کے اعتبار سے میرے لیے اچھا ہے تو اسے تُو میرے قابو میں کر دے اور اس کو میرے لیے آسان بنا دے، پھر اس میں میرے لیے برکت عطا فرما۔ اور اگر تیرے علم کامل میں یہ کام میرے لیے دین و دنیا اور انجام کار کے اعتبار سے شر ہے تو اس کام کو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے، اور میرے لیے بھلائی مقرر فرما دے جہاں کہیں بھی وہ ہو، اور پھر مجھے اس پر راضی فرما دے۔''

ہدایت اور معرفت کی طرح دُعا کے بھی درجے ہیں۔ چنانچہ اصولی بات تو یہ ہوگی کہ اگر مانگنا ہی ہے تو اللہ سے مانگو، یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ تک اسی سے مانگو۔ البتہ اللہ سے مانگنے کی اعلیٰ و ارفع چیزیں دوسری ہیں۔ توپ سے مکھیاں نہیں مارا کرتے۔ دُعا ایک بہت بڑی توپ ہے۔ اس سے بڑی شے کا شکار کرو، اس کے ذریعے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگ رہے ہو! دنیا کی حقیر چیزیں مانگ کر تم نے دُعا جیسی مؤثر شے ان پر صَرف کر دی۔ دُعا تو اعلیٰ و ارفع چیزوں کے لیے ہونی چاہیے۔ وہ ہدایت کے لیے ہو، دین کے علم اور اس کے فہم کے لیے ہو اور دین پر عمل پیرا ہونے اور اس پر استقامت و ثبات کے لیے ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ توفیق طلب کرنی چاہیے کہ اپنا تن مَن دھن اس کے دین کی سرفرازی و سربلندی کے لیے لگا دیا جائے۔ اس سے اس کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے

کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی ہمت طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ سے شہادت کی موت مانگیے، اس لیے کہ خود حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ آرزو کی ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ، لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُغْزٰی فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلُ، ثُمَّ اُغْزٰی فَاُقْتَلُ، ثُمَّ اُغْزٰی فَاُقْتَلُ)) (متفق علیہ)

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میری یہ تمنّا اور خواہش ہے کہ مَیں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں، پھر (مجھے زندہ کیا جائے اور) مَیں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں، (پھر مجھے زندہ کیا جائے اور) میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں!''

حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ملاحظہ کیجیے:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِّنْ نِفَاقٍ)) (رواہ مسلم)

''جو (مسلمان) اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی تمنّا ہی پیدا ہوئی، اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ پر ہوئی۔''

چنانچہ اللہ سے مانگنے کی چیزیں جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت ہیں۔ (۱)

''دعا ہی اصل عبادت ہے!''

گفتگو سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ پر چل رہی تھی جس سے واضح ہوتا ہے کہ دُعا اور عبادت ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں۔ اب سورۂ مریم کی چند آیات ملاحظہ کیجیے۔ ان میں بھی دُعا اور عبادت کو ہم معنی اور مترادف کے طور پر لایا گیا ہے۔ گویا دُعا اور عبادت ایک ہی

(۱) صحیح بخاری میں منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ طلب شہادت کے لیے کثرت سے یہ دُعا مانگا کرتے تھے جو قبول بھی ہوئی اور آپؓ مدینۃ النبی ﷺ میں ایک مجوسی غلام کے ہاتھوں شہید ہوئے: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ ﷺ ''اے اللہ! تُو مجھے اپنے راستہ میں شہادت کی موت عطا فرما اور میری موت تیرے رسول ﷺ کے شہر میں واقع ہو''۔ (مرتّب)

تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو دعوتِ توحید دی جو اپنے ملک کے مشرکانہ نظامِ حکومت میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے‘ خود بت تراش بھی تھے اور سب سے بڑے مندر کے پروہت بھی‘ تو باپ نے نہایت سختی سے انہیں جھڑک دیا اور حکم دیا کہ فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ‘ ورنہ میں تم کو سنگسار کر دوں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور اس موقع پر آنجنابؑ نے جو الوداعی کلمات کہے‘ ان کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝۴۷ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۠ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝۴۸ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝۴۹ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝۵۰﴾

’’(باپ کی جھڑکی اور اظہارِ غیظ و غضب کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:) اچھا تو آپ کو میرا سلام! (مَیں الگ ہو جاتا ہوں‘ پھر بھی) مَیں اپنے رب سے آپ کی مغفرت کی دُعا کروں گا‘ بے شک وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ مَیں آپ لوگوں سے بھی کنارہ کرتا ہوں اور ان (ہستیوں) سے بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں‘ مَیں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا‘ اُمید ہے کہ مَیں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔ پھر جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور ان (بتوں) سے جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے کنارہ کش ہو گیا تو ہم نے اسے اسحٰق اور (اسحٰق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا‘ اور ہر ایک کو نبی بنایا۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی۔‘‘

ان آیات سے بھی یہ بات مزید مؤکد ہو گئی کہ دُعا اور عبادت ہم معنی ہیں۔ جس کو تم نے واقعتاً اپنا معبود مانا ہے‘ اسی سے دُعا کرو گے‘ اسی کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارو گے‘ اسی سے فریاد کرو گے اور اسی کی دہائی دو گے۔

مَیں نے اس موقع پر سورۃ المؤمن کی ایک‘ اور سورۂ مریم کی چار آیات کے حوالے سے دُعا اور عبادت کا جو ربط و تعلق بیان کیا ہے‘ بعینہٖ یہی نقشہ ہے سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت کا۔ سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں ہیں‘ پہلی تین میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تمجید ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

چوتھی آیت مرکزی آیت ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ ’’(اے رب!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے‘‘۔[1] استعانت کے معنی ہیں مدد مانگنا۔ استعانت‘ استدعا‘ استمداد‘ استنصار اور استغاثہ عربی مبین کے ایسے الفاظ ہیں جن سب میں مدد مانگنے کا مفہوم مشترک ہے اور یہ دُعا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت صرف اللہ کے لیے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت میں دو چیزیں عبادت و استعانت بالکل یک جان ہو گئیں۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾

احادیثِ نبویؐ حکمتِ قرآنی کا عظیم ترین خزانہ ہے۔ قرآن حکیم کا لُبِّ لُباب اور جوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چھوٹے ارشادات اور فرمودات میں مل جائے گا‘ بالکل سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةُ)) [2] ’’دُعا عبادت کا مغز ہے۔‘‘ لفظ ’’مُخّ‘‘ میں مغز کے علاوہ گودا‘ جوہر اور لب لباب کے مفاہیم بھی موجود ہیں۔ دوسری حدیث میں تو یہ پردہ بھی اٹھا دیا گیا‘ ارشاد فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) [3] ’’دُعا ہی اصل عبادت ہے۔‘‘ جس سے تم دُعا کر رہے ہو وہی تمہارا معبود ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو پکارا ہے تو وہی آپ کا معبود ہے‘ چاہے آپ زبان سے کہہ رہے ہوں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں مانتے! لیکن اگر آپ نے کہا ’’یا علی مدد‘‘ تو آپ نے علیؓ کو اپنا معبود بنا لیا۔ آپ

(۱) عربی زبان میں فعل مضارع میں زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ (مرتّب)
(۲) سنن الترمذی‘ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ
(۳) سنن الترمذی‘ عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ

حضرت علیؓ کی پرستش اور بندگی کر رہے ہیں‘ چاہے آپ اس کا اقرار کریں‘ چاہے نہ کریں۔ توحید کا تقاضا یہی ہے کہ استدعا‘ استعانت‘ استمداد‘ استنصار‘ استغاثہ صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی دُعاؤں کو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بابرکات کے لیے خالص کر لیں۔

دعا کی قبولیت کے مختلف انداز

دُعا کے ضمن میں ایک عملی بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق کوئی دُعا کبھی بیکار یا رائیگاں نہیں جاتی۔ دُعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے لیکن اس کی مقبولیت کی تین مختلف شکلیں ہیں۔ پہلی یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگتا ہے وہ اگر اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل میں اس کے لیے خیر ہے تو وہ اسے وہی چیز عطا فرما دیتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اللہ کے علم کامل میں یہ ہے کہ میرا بندہ لاعلمی میں مجھ سے ایسی چیز مانگ رہا ہے جو اس کے حق میں مفید نہیں ہے‘ جیسے آپ کا بچہ آپ سے چاقو مانگے تو آپ اسے چاقو نہیں دیتے‘ اسی طرح اگر اللہ کے علم کے مطابق یہ چیز اس بندے کے حق میں مفید نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں بندے کو وہ چیز عطا فرما دیتا ہے جو اس کے حق میں واقعتاً مفید ہو۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی شے بھی بندے کو دینا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ میں نہیں تو اللہ تعالیٰ اس دُعا کو بندے کے لیے توشہ آخرت بنا لیتا ہے۔ آخرت میں وہ دُعا اس بندے کے لیے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جائے گی۔

اقول قول هذا واستغفر الله لی ولكم ولسائر المسلمين والمسلمات 00

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

دو روزے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اہم خطاب

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

میرے بھائیو!

سب سے پہلے تو آپ کو رمضان المبارک کی سعادت ملنے اور رمضان المبارک میں روزے رکھنے اور اس کام کے لیے توفیقِ الٰہی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ معمولی نعمت نہیں ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے وعدے فرمائے ہیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بڑی بشارتیں سنائی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))

''جس نے رمضان کے روزے رکھے' اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر و ثواب کی لالچ میں' تو اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔''

اور یہ بظاہر آخری جمعہ ہے' جمعۃ الوداع ہے' اس کے بعد جو روزے باقی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور شب قدر کی دولت و نعمت بھی عطا فرمائے' ہماری اور آپ کی عاجزانہ دعاؤں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے جو اِس مہینہ میں کی گئیں۔

اب مَیں آپ کے سامنے بظاہر ایک نئی بات کہنے والا ہوں' لیکن وہ نئی بات نہیں ہے' وہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیم سے ماخوذ ہے' اور قرآن مجید پر مبنی ہے' لیکن بہت سے بھائیوں کے لیے نئی ہوگی' اور نئی چیز کی ذرا قدر ہوتی ہے اور اس سے آدمی کا ذہن ذرا تر و تازہ' بیدار اور متوجّہ ہو جاتا ہے۔ وہ نئی بات یہ ہے:

''روزے دو طرح کے ہیں: ایک چھوٹا روزہ' ایک بڑا روزہ۔''

چھوٹے روزے کی تحقیر مقصود نہیں' صرف زمانی اور وقتی لحاظ سے کہہ رہا ہوں۔ چھوٹا روزہ کتنا ہی بڑا ہو' ۱۳ گھنٹہ' ۱۴ گھنٹہ کا روزہ ہوگا' بعض ملکوں میں جہاں دن اس زمانہ میں بڑا ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ۔ یہ وہ روزہ ہے جو بلوغ پر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے' وہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب تک قائم رہتا ہے۔ اس روزہ کا ایک قانونی ضابطہ اور اس کے کچھ شرعی احکام ہیں جو آپ کو معلوم ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس روزہ میں آدمی کھا پی نہیں سکتا اور ان تعلقات و معاملات کا لطف نہیں حاصل کر سکتا جن کی اور دنوں میں اجازت ہے۔ یہ روزہ چاہے ۲۹ دن کا ہو یا ۳۰ دن کا' اس میں محدود پابندیاں ہیں۔ رمضان کے اس روزے سے لوگ واقف اور اس کے قوانین و احکام پر عامل ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ غور کریں کہ اس روزے کے علاوہ اور کون سا روزہ ہے جو اپنے وقت اور رقبہ میں اس سے بڑا ہے! گرمی کے روزے اور بڑے ہوتے ہیں اور اس روزے کے علاوہ اور کون سا بڑا روزہ ہوگا؟ کیا شش عید کا روزہ بتانے والا ہوں' یا پندرہویں شعبان کا؟ کون سا روزہ بتانے والا ہوں؟

بڑا روزہ ہے اسلام کا روزہ! اسلام خود ایک روزہ ہے اور سب روزے اور عیدین بھی' بلکہ روزہ' نماز یہاں تک کہ جنّت بھی' جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا' وہ سب اس کے طفیل ہی ہے۔ اصل بڑا روزہ اسلام کا روزہ ہے۔ وہ کب ختم ہوتا ہے' کب شروع ہوتا ہے' یہ بھی سن لیجیے!

جو خوش قسمت انسان مسلمان گھر میں پیدا ہوا' اور وہ شروع سے کلمہ گو ہے' اس پر بلوغ کے بعد ہی یہ طویل مسلسل روزہ فرض ہو جاتا ہے۔ اور جو اسلام لائے' کلمہ پڑھے' یہ روزہ اس پر اسلام قبول کرنے کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔

اور یہ روزہ کب ختم ہوگا' یہ بھی سن لیجیے۔ رمضان کا روزہ اور نفلی روزہ تو غروبِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے' مگر اسلام کا یہ روزہ تو آفتابِ عمر کے غروب ہونے پر ختم ہوگا۔

رمضان کے روزہ و نفلی روزہ کا افطار کیا ہے! آپ عمدہ سے عمدہ مشروب اور لذیذ سے لذیذ غذا سے افطار کر سکتے ہیں۔ زیادہ مشروبات اور ماکولات کا نام سن کر آپ کے مُنہ میں پانی آ جائے گا اور شوق پیدا ہو جائے گا' اس لیے مَیں ان کا نام نہیں لیتا۔ وہ روزہ زمزم سے کھلتا ہے' وہ روزہ ٹھنڈے پانی سے کھلتا ہے' یا دوسرے مشروبات سے یا کھجور وغیرہ سے کھلتا ہے۔ اور زندگی کا یہ طویل و مسلسل روزہ کس سے کھلے گا؟ حضرت محمدؐ رسول اللہ' محبوبِ ربّ العالمین' شفیع

المذنبین‘ سید المرسلین ﷺ کے دستِ مبارک سے جامِ طہور‘ جامِ کوثر سے کھلے گا۔ اگر وہ روزہ پکا ہے اور آپ نے اس روزے کی شرائط پوری کر دی ہیں اور محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل سے ہم دنیا سے کلمہ پڑھتے ہوئے گئے‘ ہماری روح اس حال میں نکلی کہ ہماری زبان پر کلمہ تھا اور ہم ’’لا الٰہ الّا اللہ محمدٌ رسول اللہ‘‘ کہہ رہے تھے‘ ہمارے دل میں نورِ ایمان تھا‘ ہمارے دماغ میں اللہ سے ملاقات اور حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کا شوق تھا‘ تو وہ روزہ اس وقت ختم ہوتا ہے۔

اس کا افطار کیا ہے؟ اس کی ضیافت کیا ہے؟ وہ ہے جس ضیافت پر آدمی اپنی جان دے دے —— اور اللہ کے بندوں نے جان دی ہے۔ سینکڑوں اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس شوق میں جان دی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا دیدار نصیب ہو‘ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے ہم جب ہوں تو وہ ہم سے خوش ہوں‘ راضی ہوں۔ جہاد کے واقعات‘ غزوات اور جنگوں کے واقعات پڑھیے۔ لوگوں نے خوشی خوشی جانیں دیں‘ بلکہ ایسا شوق تھا کہ ایک بچہ اُحد کی جنگ کے موقع پر آیا۔ اُس نے کہا: یارسول اللہ! مجھے بھی جہاد کرنے کی اجازت دیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی تم چھوٹے ہو۔ اس نے کہا: مَیں چھوٹا نہیں‘ مَیں لڑ سکتا ہوں۔ اس نے بڑی خوشامد کی‘ کسی نے سفارش بھی کی تو آپؐ نے اجازت دے دی۔ دوسرے صاحبزادے آئے جو ذرا چھوٹے تھے‘ کہنے لگے: آپؐ نے انہیں اجازت دی تھی‘ مجھے بھی اجازت دے دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ابھی بچے ہو۔ اُس نے عرض کیا: آپؐ ہماری کشتی کرا کر دیکھ لیجیے۔ اگر مَیں اس کو پچھاڑ دوں تو مجھ کو اجازت دے دیجیے۔ یہ بچوں کا شوق تھا‘ کشتی ہوئی‘ اس نے واقعی پچھاڑ دیا اور آپ ﷺ نے ان کو بھی اجازت دے دی اور وہ شہید بھی ہوئے۔ ابوجہل کو دیکھ کر دونوں بھائیوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہمیں ابوجہل کو دکھایئے‘ ہم نے سنا ہے کہ اس نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے‘ مَیں یہ شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ابوجہل کے بارے بتانے پر دونوں لپک پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

اس چھوٹے روزہ کا حکم اور اس کی پابندیاں سب کو معلوم ہیں۔ سب روزہ دار کھانے پینے سے اور ان تمام چیزوں سے بچتے ہیں جو ممنوع ہیں‘ لیکن اس بڑے روزہ کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے‘ حالانکہ یہ روزہ ہم لوگوں کو اس بڑے روزہ کے طفیل ہی ملا ہے‘ اس بڑے روزہ کی برکت

سے ملا ہے۔ یوں سمجھیے کہ اس بڑے روزہ کے انعام میں ملا ہے‘ اور عید بھی اسی روزے کے طفیل میں ملی ہے۔ اگر اسلام نہ ہوتا تو نہ نماز ہوتی‘ نہ روزہ ہوتا۔ اور دیکھ لیجیے جہاں اسلام نہیں وہاں نہ نماز ہے‘ نہ روزہ ہے‘ نہ کلمہ ہے‘ نہ اللہ پر یقین ہے‘ نہ اس کے واحد ہونے کا یقین ہے‘ نہ حشر کا‘ نہ روزِ قیامت کا‘ نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا‘ یہ سب دولت ایمان ہم کو اسلام کے طفیل ملی ہے۔ ہم گن بھی نہیں سکتے کہ کیا کیا دولتیں ہم کو اسلام کے طفیل ملی ہیں۔ اسلام کے طفیل میں آدمیت ملی ہے‘ انسانیت ملی ہے‘ عزّت ملی ہے‘ طاقت ملی ہے‘ روحانیت ملی ہے‘ اور مرنے کے بعد قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت ملے گی‘ اس کا تو پوچھنا ہی کیا: ((مَا لَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)) ’’نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا‘‘۔ تو اس (طویل و مسلسل) روزے کا لوگوں کو کم خیال آتا ہے۔

اب ہم آپ کو بتاتے ہیں‘ معلوم نہیں پھر کبھی ہماری آپ کی ملاقات ہو یا نہ ہو اور ہمیں کچھ کہنے سننے کا موقع ملے یا نہ ملے‘ بڑے کام کی بات آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اس روزہ (رمضان کے روزہ یا نفلی) میں پانی پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے‘ کھانا کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے‘ یہ روزہ ٹوٹ جائے تو ساٹھ روزے رکھنے چاہئیں‘ تب ان کی قضا ہوگی‘ لیکن وہ روزہ جو اسلام کا روزہ ہے اس کا بہت کم لوگوں کو خیال ہے۔ ہم بتاتے ہیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں منع ہیں۔ اس میں کھانے پینے کی محدود چیزیں جو حرام ہیں‘ منع ہیں۔ اس میں شرک منع ہے۔ سب سے بدتر چیز جو اللہ کو ناپسند ہے‘ وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں صاف فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾

(النساء:۴۸)

’’اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا‘ باقی جس کو چاہے گا معاف فرما دے گا‘‘۔

شرک کیا ہے‘ آپ سن لیجیے۔ اس کو سب برا سمجھتے ہیں‘ آپ بھی برا سمجھتے ہوں گے۔ عقیدہ یہ ہے کہ کارخانۂ عالم اللہ کا بنایا ہوا ہے اور وہی چلا رہا ہے: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ﴾ (الاعراف:۵۴) اُسی کا کام ہے پیدا کرنا‘ اُسی کا کام ہے چلانا۔ اُسی کو مانتے ہیں کہ خالقِ ارض و سماوات اور کائنات چلانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے‘ لیکن بہت سے بھائی ایسے ہیں جن کے دل میں اور کبھی اُن کے دماغ میں یہ بات پورے طور سے جذب نہیں ہوتی ہے کہ کائنات کا

چلانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ کارخانۂ عالَم تو اللہ نے بنایا' ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' کہہ دیا' بس بن گئی' لیکن چلانے میں دوسری ہستیاں شریک ہیں' جیسے کوئی بادشاہ اپنی مرضی سے کوئی کام کسی کے سپرد کر دے' کسی کے ذمہ کر دے' بھائی تم خیرات بانٹا کرو' تم دیکھو کھانے پینے کا خیال رکھنا' غلّہ پہنچا دو' کچھ پہنچا دو جس کی ضرورت ہو' کوئی بیمار ہو اس کو شفا دے دو' کسی کے اولاد نہیں ہے اس کو اولاد عطا کرو' کوئی کسی مصیبت میں گرفتار ہے' اس کی خلاصی کر دو' کسی کا مقدمہ جتا دو وغیرہ وغیرہ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں کے ذمہ کچھ کارخانے کر دیے ہیں تو اس میں اللہ کی شان کے خلاف کوئی بات نہ ہوگی' ان کی قبولیت اور بزرگی کی وجہ سے اور اپنے ارادہ سے سپرد کیا ہے اور جب چاہے گا لے لے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا ہی کام ہے پیدا کرنا' اور میرا ہی کام ہے چلانا اور حکم دینا ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ﴾ —— یہ دنیا تاج محل نہیں ہے کہ شاہجہاں بنا کر چلے گئے' اب اس کے بعد کوئی چاہے دیوار پر کچھ لکھ دے' دھبہ لگا دے' کھونچا لگا دے' کوئی حصّہ توڑ دے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے' ان کے بس میں کچھ نہیں' اور شاہجہاں کیا خواہ بڑے سے بڑا بادشاہ اور حکمراں ہو۔

لیکن وہ کارخانہ یعنی کارخانۂ عالَم پورے طور سے اُسی کے قبضہ اور اختیار میں ہے' وہی خالقِ کائنات ہے' ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور وجود بخشنے والا ہے' اور وہی حکمراں' سیاہ سفید کرنے والا' جِلانے مارنے والا' روزی اور اولاد دینے والا ہے۔ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۸۲﴾﴾ (یٰسٓ)۔ اولاد دینا' روزی دینا' قسمت اچھی بری کرنا' ہرانا جتانا' کسی کو عزت دینا' کسی کی آئی ہوئی بلا کو ٹال دینا' یہ سب اللہ کے قبضہ میں ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اس دنیا کا ایک پتّہ اور ایک ذرّہ بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا' پوری باگ ڈور' عنانِ حکومت اور کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ توحید کامل ہونی چاہیے۔ اولاد وہی دے سکتا ہے' روزی وہی دے سکتا ہے' عزّت وہی دے سکتا ہے' جلانا مارنا اُسی کا کام ہے' یہ نہ کسی ولی کے قبضہ میں ہے' نہ کسی قطب کے قبضہ میں ہے' نہ کسی غوث کے قبضہ میں ہے' نہ کسی ابدال کے قبضہ میں ہے۔ ایک بات یہاں سے لے کر جایئے۔ پہلے عقیدۂ توحید کو جانچیے کہ آپ اللہ ہی کو مُسبّب الاسباب سمجھتے ہیں

اور خالق و رازق سمجھتے ہیں؟

ایک بات تو یہ' اور اس کے بعد دوسری بات قیامت کا یقین و آخرت کا یقین ہے' اور اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ کو آخری پیغمبر ماننا' خاتم النّبیّین' سید المرسلین' شفیع المذنبین' محبوب ربّ العالمین ماننا' اور یہ ماننا کہ شریعت انہی کی چل رہی ہے اور قیامت تک چلے گی' اور آخرت میں کام آئے گی۔ قیامت تک اور کسی کی شریعت نہیں چلے گی۔ اگر کوئی آپ ﷺ کے بعد نئی شریعت لے کر آئے تو وہ کذّاب اور دجّال ہے' ملحد ہے' دین کا باغی ہے اور واجب القتل ہے۔ شریعت' شریعتِ محمدیؐ ہے اور وہی قیامت تک چلے گی اور ہر جگہ چلے گی۔ اس پر جو چلے گا وہی فلاح یاب ہوگا اور سرخرو ہوگا۔

آپ ﷺ حبیبِ خدا ہیں' جو آپؐ سے محبت کرے خدا اُس سے محبت کرتا ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))

''تم میں سے کوئی مؤمن نہیں جب تک کہ مَیں اُسے اپنے باپ سے' بیٹے سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

یہ مرتبہ اور کسی بزرگ' ولی کیا چیز' کسی نبی اور رسول کو بھی نہیں ملا۔ یہ مرتبہ خدا نے آپ ﷺ کے لیے رکھا تھا۔ ایک تو یہ کہ آپؐ پر ایمان بھی ہو' عقیدہ بھی ہو' محبّت بھی ہو اور شفاعت کا شوق بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ میں شریعت پر چلنے کا اہتمام بھی ہو۔ آپ پوچھیں' آپ کے اندر جذبہ اور جستجو اس بات کی ہو کہ مسئلہ بتایئے! لیکن افسوس کہ مسلمانوں میں یہ بات پورے طور پر نہیں ہے۔ شادی بیاہ کس طریقہ پر ہو' حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا طریقہ کار تھا' خوشی کا اظہار اور غم کا اظہار بھی شریعت و سُنّت کے مطابق ہونا چاہیے۔ ماتم کرنا' گانا بجانا' یہ تزک و احتشام' دھوم دھام اور شادیوں میں وہ سب کام کرنا' چاہے سود لے کر اور زمینیں بیچ کر' رشوت لے کر ہو' بس جس سے نام ہو' ہماری حیثیت عرفی بلند ہو' لوگوں میں اونچے سمجھے جائیں۔ اور یہ جہیز کا مطالبہ اور نہ دینے پر نازیبا سلوک' کہ گردن شرک سے جھک جائے' کیسی بُری بات ہے۔ یہ سب شریعت کے خلاف ہے' اللہ کو ناپسند ہے۔ ان سب باتوں میں ہم شریعت کے پابند ہیں۔ صرف نماز و روزہ میں ہی پابند نہیں ہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں پابند ہیں۔ ہر چیز میں

ہمارے لیے نمونہ اُسوۂ رسول ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آلِ عمران : ۳۱)

''(اے پیغمبر ﷺ! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔''

تو ایک بات یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی پر عمل ہو اور شریعت کو آپ سمجھیں کہ وہ پوری زندگی میں نافذ ہے، پوری زندگی پر اس کا سایہ ہے، پوری زندگی اس کے ماتحت ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس نماز و روزہ شریعت کے مطابق ہوں، اس کے لیے مسئلہ پوچھیں، اور نکاح و طلاق، تجارت اور کاروبار میں آزاد ہیں۔ لاٹری بھی چل رہی ہے، جوا بھی چل رہا ہے، ٹیلی ویژن بھی دن رات چل رہا ہے (جو لہو الحدیث کی بہترین تشریح ہے)، اسراف اور فضول خرچی بھی چل رہی ہے، نمود و نمائش بھی جاری ہے، ہمسایہ قوم (یعنی ہندو) کی نقالی بھی چل رہی ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد روزہ میں جیسے غیبت منع ہے ایسے ہی اس روزہ میں بھی غیبت منع ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا، فحش بکنا، رشوت لینا اور رشوت دینا، سود خوری، اسراف اور فضول خرچی ممنوع ہے۔ تو آپ یہ سمجھ کر جائیں روزہ کے بعد ہم آزاد ہیں، ہرگز نہیں! ہم آزاد نہیں ہیں، وہ روزہ برابر چلتا رہے گا، وہ روزہ اب بھی ہے۔ بلکہ وہ اس روزہ پر بھی سایہ فگن ہے، اور یہ روزہ اس روزہ کا جزو ہے جو آپ رکھ رہے ہیں۔ وہ روزہ چلتا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ یہی سب سے بڑی چیز اور تمنّا کرنے کی ہے، بلکہ جس کے لیے جان کی بازی بھی لگا دینا چاہئے۔ ہماری آزادی، غریبی، مفلسی، دوستی، دشمنی، کامیابی اور ناکامی، یہ سب گزر جائے گی، بس خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ اولیاء اللہ کو اس کی بڑی فکر تھی۔ ان کے حالات پڑھئے، جن کا نام لینے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ ان کو یہ فکر ہوتی تھی، بلکہ دوسروں سے دعا کراتے تھے، کہ خاتمہ بخیر ہو۔ سب کے دل کو یہ لگی ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے خاتمہ بخیر فرمایا، ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔

رمضان ختم ہونے کے بعد آپ یہ نہ سمجھیں کہ چھٹی ہوگئی، اب ہم آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ ہرگز ایسا نہیں، آپ آزاد بالکل نہیں ہیں۔ آپ کے گلے میں اسلام کا طوق پڑا ہوا ہے۔ آپ کی تختی، آپ کے شناختی کارڈ پر لکھا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس

روزہ کا حساب ہوگا اور اُس روزہ کا بھی حساب و کتاب ہوگا۔ ہم نے آپ کے سامنے آیت پڑھی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

''مَیں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا....'' چاہے کوئی تبدیلی لانا چاہے، سلطنت کہے، بادشاہ کہے کہ ایسا کرو اور ویسا کرو، بڑے سے بڑا مسلمان اور علم کا دعویٰ کرنے والا کہے، کچھ ہونے کو نہیں۔ جو چیز حرام ہے قیامت تک حرام رہے گی۔ دنیا میں کسی کو یہ اجازت نہیں اور نہ اس کی مجال ہے کہ اس میں ترمیم کرے۔ شریعت میں اب کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی، وہ چیزیں جو حرام ہیں حرام ہی رہیں گی۔

یہاں سے آپ ارادہ کر کے جایئے کہ اگر کسی کی جائیداد آپ کے قبضہ میں ہے اور آپ کی نہیں ہے تو اس روزہ کا تقاضا ہے کہ آپ اس جائیداد کو چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ اس پر بڑا خوش ہوگا، آپ اللہ کے خوف سے ایسا کریں اور کہیں کہ لو اپنی جائیداد، اپنا ترکہ، یہ تمہیں مبارک ہو، اب ہم نے توبہ کی ہے۔ جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا، دل آزاری کرنا، گالی بکنا، ناجائز، حرام ذرائع آمدنی، رشوت وغیرہ جن سے پیسے ملتے ہیں، حرام ہی ہیں اور قیامت تک ناجائز ہی رہیں گے۔ اسی طرح سود ہے کہ بعض لوگ اس دورِ پُرفتن میں اس کے جواز کی شکلیں نکال رہے ہیں، کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ جس چیز کو شریعت و دین نے حرام قرار دیا ہے، قیامت تک حرام ہی رہے گی۔

کوشش یہ کیجیے کہ آپ کا روزہ صحیح طریقہ پر افطار ہو، شاہ غلام علی صاحب، مجددی، دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے کبار مشائخ میں تھے۔ نواب میر خاں نے جو اُن کے مرید تھے، ارادہ کیا جب انہوں نے سنا کہ حضرت کے یہاں پانچ پانچ سو آدمی رہتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں اور آپ ہی کو ان کی ضروریات پوری کرنا پڑتی ہیں، کوئی آمدنی نہیں، کوئی جائیداد نہیں، تو انہوں نے ایک بڑی رقم پیش کرنا چاہی اور کہا کہ حضرت اس کو قبول فرمالیں۔ فرمایا کہ فقیر نے روزہ رکھا تھا اور جب آفتاب ڈوبنے لگے تو کوئی روزہ نہیں توڑتا۔ اب میرا آفتابِ عمر ڈوبنے کے قریب ہے۔ اب کوئی جتنا کہے کہ یہ چیزیں لے لو، یہ دوا کھالو، مَیں روزہ نہیں کھولوں گا،

کہ تمام دن روزہ رکھا اور اب جب افطار کا وقت قریب ہے تو توڑ دوں!

ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسلام کا روزہ ہے' ساری عمر کا روزہ ہے' کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ جو چیزیں حرام ہیں' حرام ہیں' غلط ہیں' غلط ہیں' عقیدہ خالص ہونا چاہیے۔ سمجھ لیجیے' نہ کوئی قسمت بری بھلی بنا سکتا ہے' نہ کوئی آئی ہوئی بلا کو ٹال سکتا ہے' نہ اولاد دے سکتا ہے' نہ نوکری دلا سکتا ہے' کہ آپ کسی اور سے مانگیں' جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگیں جو سمیع و مجیب ہے۔ وہ فرماتا ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۱۸۶﴾ (البقرۃ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہ بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دیجیے کہ میں قریب ہوں' دعا کرنے والی کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ دعا کرے۔

آپ یہاں سے بڑے روزے کا خیال لے کر جایئے' خوش ہوئیے' اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ یہ روزہ تو ختم ہو رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اور رمضان نصیب کرے۔ مگر زندگی کا کوئی اعتبار نہیں' صحت کا اعتبار نہیں' ہاں وہ مسلسل وطویل روزہ رہے گا' وہ روزہ مبارک ہو' اس روزہ کا خیال رکھیے' وہ روزہ نہ توڑیے گا' وہ روزہ اگر ٹوٹا تو سب کچھ ٹوٹ گیا' سب کچھ بگڑ گیا۔

بس یہی دو روزے ہیں' ایک روزہ ہے قریب المیعاد' وہ ہے رمضان کا روزہ اور دن بھر کا روزہ ہے۔ ایک روزہ وہ ہے جو زندگی کے ساتھ رہے گا' اور مسلمان کے لیے جب سے وہ بالغ ہوا' اس دن تک جب تک سانس اور جان میں جان ہے۔ اور وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا اس کا بھی جب تک بدن میں اس کے جان اور روح ہے' اس وقت تک باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اس روزے کو برقرار رکھیں' اس روزے کی حفاظت کریں اور قدر کریں' اور اس روزے پر جئیں اور مریں۔

رَبِّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(یہ تقریر ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی میں کی گئی۔ مقرر علیہ الرحمۃ نے خود اس پر نظر ثانی کی۔)

رمضان المبارک کا جامع پروگرام:

دن کا روزہ‘ رات کا قیام

عاطف محمود☆

دینِ اسلام میں عبادات دو قسم پر ہیں: ایک بدنی اور دوسری مالی۔ بدنی عبادت سے مراد وہ عبادت ہے جس میں بدن کا استعمال زیادہ ہوتا ہے جب کہ مالی عبادت میں مال کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ نماز اور روزہ بدنی عبادات ہیں‘ جب کہ زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ حج مالی اور بدنی عبادات دونوں کا جامع ہے۔ ان عبادات میں روزہ خاص اہمیت کی حامل عبادت ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّمَ: ((إِنَّ رَبَّكُمْ يَقُولُ: كُلُّ حَسَنَةٍ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَالصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ ۔ الصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّارِ)) (سنن الترمذي)

’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک تم لوگوں کا ربّ فرماتا ہے کہ ہر نیکی کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے‘ البتہ روزہ خاص میرے لیے ہے اور مَیں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ جہنم سے بچاؤ کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔‘‘

قرآنِ حکیم میں روزہ فرض کرنے کی حکمت حصولِ تقویٰ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾﴾ (البقرة)

’’اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر

☆ ناظم تعلیمات‘ قرآن اکیڈمی یٰسین آباد‘ کراچی

فرض کیا گیا تھا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔‘‘

رمضان المبارک کی بہت سی فضیلتیں ہیں‘ البتہ اس کی ایک اہم فضیلت یہ ہے کہ اس ماہِ مبارک میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا۔ قرآنِ حکیم اللہ ربّ العزّت کی سب سے بڑی نعمت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ جو چیز جڑ جائے گی‘ اسے بھی بے پناہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں فرماتے ہیں:

فلهذا أنزل أشرف الكتب بأشرف اللغات، على أشرف الرسل، بسفارة أشرف الملائكة، وكان ذلك في أشرف بقاع الأرض، وابتدأ إنزاله في أشرف شهور السنة وهو رمضان

’’اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ باعزّت کتاب کو سب سے زیادہ باعزّت زبان (یعنی عربی) میں‘ سب سے زیادہ باعزّت رسول (ﷺ) پر‘ سب سے زیادہ باعزّت فرشتے کے ذریعے‘ سب سے زیادہ باعزّت سرزمین پر نازل کیا‘ اور سب سے زیادہ باعزّت مہینے میں یعنی رمضان المبارک میں اس کے نزول کا آغاز فرمایا۔‘‘

قرآنِ حکیم میں بھی ماہِ رمضان المبارک کی فضیلت کی اہم وجہ نزولِ قرآن کو بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ ربّ العزّت ارشاد فرماتے ہیں:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرة:۱۸۵)

’’رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دیتی ہیں۔‘‘

اب تک کی گفتگو سے یہ بات سامنے آئی کہ ماہِ رمضان المبارک کی دو اہم ترین فضیلتیں روزہ اور قرآنِ حکیم کا نزول ہے۔ یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ قرآنِ حکیم سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے تقویٰ ضروری ہے اور تقویٰ کے حصول کا ایک بہت بڑا ذریعہ روزہ ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے رمضان المبارک میں دو اہم ترین عبادات رکھی گئی ہیں یعنی دن کا روزہ اور رات کا قیام۔ کیونکہ رات کے قیام کا ایک اہم مقصد قرآنِ حکیم کی تلاوت اور سماعت ہے۔ چنانچہ احادیثِ مبارکہ میں دن کے روزہ اور رات کے قیام کو ایک ہی انداز میں ذکر کیا گیا ہے‘ جیسا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ))

(صحيح البخاری)

''جس نے رمضان میں ایمان اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے روزہ رکھا تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ))

(صحيح البخاری)

''جس نے رمضان میں ایمان اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے رات کو قیام کیا تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح آدمی پورا دن روزہ میں گزارتا ہے اسی طرح پوری رات یا کم از کم رات کا اکثر حصہ قیام یعنی تراویح میں گزارے۔ چنانچہ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو تین دن جماعت سے نماز پڑھائی اور راوی کا بیان ہے کہ تیسرے دن اتنی طویل نماز پڑھائی کہ لگتا تھا کہ شاید آج سحری کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس اندیشے سے کہ کہیں یہ رات کی نماز اُمّت پر فرض نہ ہو جائے' جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کا سلسلہ مزید جاری نہیں رکھا' البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو تنہا ادا فرماتے رہے' تا آنکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں تراویح کی نماز کو باجماعت شروع کروانے کا اہتمام فرمایا جس پر آج تک متواتر عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

رمضان المبارک کی ایک بڑی فضیلت قرآنِ حکیم کا نزول ہے اور قرآنِ حکیم سے تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے ہمارے دین میں نمازِ تراویح کو رمضان کی ایک اہم عبادت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جمہور فقہاء کے نزدیک تراویح سُنّتِ مؤکدہ ہے اور اس کے ادا کرنے کی تفصیل میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ ہر چار رکعات باجماعت ادا کرنے کے بعد اتنی دیر تک بیٹھنا مسنون ہے کہ جتنی دیر میں چار رکعات ادا کی گئی ہیں۔ اس وقفہ میں ہر آدمی اپنے انفرادی معمولات میں مشغول رہے جس میں دعا' نوافل' قرآن حکیم کی تلاوت' ذکر و اذکار وغیرہ شامل ہیں۔ اہلِ مکّہ

اس وقفہ میں طواف کیا کرتے تھے جبکہ اہلِ مدینہ مزید چار رکعات پڑھا کرتے تھے۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تراویح کی ۳۶ رکعات ہیں۔

اگر اس معمول کے ساتھ تراویح کی نماز ادا کی جائے تو یقیناً اس میں رات کا اچھا خاصا وقت صَرف ہو گا اور یہی نمازِ تراویح کی اصل روح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی طویل نماز پڑھائی' اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی نظر آتا ہے' چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی اپنی مشہور کتاب موطأ میں چند صحابہ کرامؓ کا معمول اس طرح بیان فرماتے ہیں:

عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّهُ قَالَ: ------- وَقَدْ كَانَ الْقَارِئُ يَقْرَأُ بِالْمِئِينَ حَتّٰى كُنَّا نَعْتَمِدُ عَلَى الْعِصِيِّ مِنْ طُولِ الْقِيَامِ وَمَا كُنَّا نَنْصَرِفُ إِلَّا فِي فُرُوعِ الْفَجْرِ (موطأ امام مالک)

''سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ تراویح کی امامت کرنے والا ایک ہی رکعت میں سو سو آیات تلاوت کیا کرتا تھا' یہاں تک کہ ہم طویل قیام کی وجہ سے لکڑیوں کا سہارا لیتے تھے اور طلوعِ فجر کے بالکل قریب ہی فارغ ہوتے تھے۔''

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ: كُنَّا نَنْصَرِفُ فِي رَمَضَانَ فَنَسْتَعْجِلُ الْخَدَمَ بِالطَّعَامِ مَخَافَةَ الْفَجْرِ (موطا امام مالک)

''عبداللہ بن ابی بکرؒ سے راویت ہے کہ مَیں نے اپنے والد سے سنا' وہ فرماتے تھے کہ ہم رمضان میں تراویح پڑھ کر جب واپس آتے تھے تو فجر کے طلوع ہونے کے ڈر سے اپنے خُدّام کو سحری جلد لانے کی تاکید کرتے تھے۔''

عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ هُرْمُزَ الأَعْرَجَ يَقُولُ: كَانَ الْقَارِئُ يَقُومُ بِسُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي ثَمَانِ رَكَعَاتٍ' وَإِذَا قَامَ بِهَا فِي اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً رَأَى النَّاسُ أَنَّهُ قَدْ خَفَّفَ (موطا امام مالک)

''حضرت عبدالرحمٰن بن ہرمز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تراویح میں قاری آٹھ رکعات میں سورۃ البقرہ کی تلاوت کیا کرتا تھا' اور اگر قاری اس سورت کو بارہ رکعات میں پڑھتا تو لوگ سمجھتے کہ قاری نے آج ہلکی تراویح پڑھائی ہے۔''

ان روایات سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تراویح میں طویل قیام کا تھا اور اسی کو دیکھتے ہوئے فقہائے کرامؒ نے اسے سُنّت قرار دیا ہے۔ البتہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

وقت گزرنے کے ساتھ اس میں بتدریج کمی آتی چلی گئی اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ مشکل سے ایک گھنٹے میں بیس تراویح پڑھ کر لوگ فارغ ہوجاتے ہیں اور پھر رمضان المبارک کے قیمتی اوقات بازاروں اور دیگر خرافات میں ضائع کرتے ہیں۔

رمضان المبارک کا اصل مقصد قرآنِ حکیم سے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے جب کہ اُمّتِ مُسلمہ اب اس حوالے سے انتہائی کمزوری اور غفلت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کمزوری کو رفع کرنے اور اُمّتِ مُسلمہ کا تعلق دوبارہ قرآنِ حکیم سے استوار کرنے کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ نے بھی اسی عزم کا اظہار اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا' چنانچہ مالٹا کی قید سے واپس آ کر علماء سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

''مَیں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن حکیم کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے وہیں سے عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کروں کہ قرآن حکیم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے' بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔'' (اقتباس از ''وحدتِ اُمّت'' مفتی محمد شفیعؒ)

شیخ الہندؒ کی زندگی نے زیادہ دیر وفا نہ کی' چنانچہ وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکے' البتہ موجودہ دور میں اس کام کو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ چنانچہ عوامی دروسِ قرآن کی مجالس کو ملک بھر میں قائم فرمایا اور رمضان المبارک میں خاص طور پر نمازِ تراویح کے ساتھ قرآن حکیم کی مختصر تشریح بیان کرنے کا سلسلہ بھی جاری فرمایا۔ شروع میں بعض حضرات نے اس پر اعتراض بھی کیا کہ یہ ایک نئی بدعت شروع ہوگئی ہے' لیکن بعد ازاں اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اب الحمدللہ علماء کے حلقے میں بھی اس کو سراہا جا رہا ہے' بلکہ اب بیشتر ائمہ اپنی مساجد میں تراویح کے بعد مختصر خلاصہ مضامین قرآن کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

غور کیا جائے تو یہ کوئی بدعت نہیں ہے' بلکہ اس کا جواز خود فقہاء کرام کے فتاویٰ سے ملتا ہے۔ تراویح کا اصل مقصد قرآنِ حکیم سے تعلق کو مضبوط بنانا ہے' اس لیے تراویح کو حتی الامکان

طول دینا سُنّت ہے۔ اگر دیکھا جائے تو آج کے دور میں اس سُنّت کو زندہ کرنے میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا بہت بڑا کردار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس پروگرام کو ''دورۂ ترجمۂ قرآن'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے جس میں تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن حکیم کے ایک حصے کا پہلے ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے' پھر اتنے ہی حصّہ کی تراویح میں تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ قرآنِ حکیم کے پیغام کو عام کرنے اور اس کے پیغام کو سمجھنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس پروگرام کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور ان کے متبعین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور یہ پروگرام اُمّتِ مُسلمہ کا قرآن حکیم سے تعلق دوبارہ استوار کرنے میں مدد و معاون بن سکے۔ (آمین!)

❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر　　بغیر عین کا اِک عرب ہم نے دیکھا!

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ (النساء:۱۷۱) کہ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم صرف یہود و نصاریٰ کے لیے ہی نہیں تھا' ہمارے لیے بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور ہر اُس گناہ اور جرم میں بے دھڑک اپنا حصّہ ڈالنے کی کوشش کی جس کا ارتکاب کر کے پچھلی اُمتیں راندۂ درگاہ ہوئی تھیں۔ سوائے اس کے کہ قرآن کے متن میں ہم تحریف نہیں کر سکے اور وہ بھی اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفّظ حاصل ہے۔ ورنہ اگر ممکن ہوتا تو اس میدان میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہ رہتے۔ ❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

رجوع الی القرآن واستقبالِ رمضان

عبدالرزاق کوڈواوی

یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں لطف وکرم ہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر ہمیں اس عظیم دولت سے مالا مال کررہا ہے جسے ہم رمضان المبارک کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ' گناہوں کو جلادینے والا مہینہ' روزے اور تراویح کا مہینہ' اعتکاف اور شبِ قدر کا مہینہ' دعاؤں کی قبولیت اور گناہوں کو بخشوانے کا مہینہ' صدقہ فطر کی ادائیگی کا مہینہ' قربِ خداوندی اور حصولِ معرفتِ الٰہی کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے اور سرکش شیاطین کو قید کردیا جاتا ہے۔ اس مہینہ میں ایک نفل کی ادائیگی کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستّر فرائض کی ادائیگی کے برابر کردیا جاتا ہے۔ یہ لوگوں کے ساتھ غم خواری اور صبر کا مہینہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''رمضان کا مہینہ آگیا ہے جو بڑی برکتوں اور عظمتوں والا مہینہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں' دعاؤں کو قبول اور گناہوں کو معاف فرماتے ہیں۔ پس اللہ کو اپنی نیکی دکھلاؤ۔ بدنصیب ہے وہ مسلمان جو اس مہینے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوجائے۔'' (صحیح البخاری)

رمضان المبارک کی یہ ساری فضیلت نزولِ قرآن کی بدولت ہے کہ اس مبارک مہینے میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ یہ ہدایت اور روشنی کی کتاب ہے' نسخۂ کیمیا اور کتابِ انقلاب ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهُ))(صحيح البخارى)

''تم میں سے افضل ترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور اس کو سکھائیں۔''

قرآن حصولِ معرفتِ الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے' چنانچہ حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل درجہ کا مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک علم حاصل نہ کرے' عالم بلاعمل کے نہیں ہوسکتا' عمل بغیر زُہد کے نصیب نہیں ہوتا' زُہد بنا تقویٰ کے حاصل نہیں ہوتا' تقویٰ بغیر انکساری کے حاصل نہیں ہوتا' انکساری بغیر نفس کی معرفت کے حاصل نہیں ہوتی اور نفس کی معرفت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک قرآنِ حکیم میں تدبّر اور تفکّر نہ کیا جائے۔'' (خطباتِ نبویؐ)

معلوم ہوا کہ قرآن اصلاح وتربیت' حصولِ علم' حصولِ تقویٰ' حصولِ انکساری اور حصولِ معرفت کا بہترین ذریعہ ہے۔ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے' غور وفکر کرنے اور اس میں تدبّر اور تفکّر کرنے کو درحقیقت قربِ خداوندی اور معرفت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

اسی مقصد کے حصول کے لیے تنظیم اسلامی اور انجمن خُدّام القرآن کے تحت اس ماہِ مبارک میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن اور خلاصۂ مضامینِ قرآن کے پروگرام منعقد ہوتے ہیں تاکہ اس کتاب کو شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ الحمدللہ اس رمضان میں بھی ملک بھر میں پچاس سے زیادہ مقامات پر یہ پروگرام ہوں گے جن میں شرکت کا خصوصی اہتمام کیا جانا چاہیے۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر اپنے خطبہ میں قرآن مجید کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ ''عنقریب ایک فتنہ سر اٹھائے گا!'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: یارسول اللہ ﷺ! ''اس فتنہ سے کیا چیز ہمیں نجات دے گی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''قرآن مجید! جس میں تمہارے اگلوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں گے اس میں ان کا فیصلہ موجود ہے۔ یہ قرآن ایک دوٹوک کتاب ہے' کوئی دل لگی نہیں..... جو اس قرآن کو چھوڑ دے گا اللہ اس کی کمر توڑ دے گا اور جو اس کے علاوہ کسی اور شے کو مرجعِ ہدایت بنائے گا' اللہ اس کو گمراہ کردے گا۔ اللہ عزوجل کا بتایا ہوا سیدھا راستہ یہی ہے۔ اس قرآن کے ہوتے ہوئے خواہشیں گمراہ نہیں ہوتیں' زبانیں لڑکھڑاتی نہیں' علماء اس سے کبھی آسودہ نہیں ہوتے۔ اس کے سنتے ہی جِنّات پکار اٹھے کہ ہم نے ایک عجیب وغریب قرآن سنا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے۔ جس نے قرآن کے موافق بات کہی اُس نے سچ کہا' جس نے اس پر عمل کیا وہ اجر وثواب کا مستحق ہوا' اور جس نے اس کی طرف دعوت دی اس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی۔''

قرآنِ مجید کے برکات اور انوارات کی یہ صرف چند ایک مثالیں ہیں اور اسی قرآن پر عمل پیرا ہو کر ہم دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کو حاصل کر سکتے ہیں جب کہ اسے چھوڑ کر ہم اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کرنے والے ہوں گے۔

آج ہم جن حالات اور پریشانیوں سے گزر رہے ہیں اس کی واحد وجہ قرآن مجید سے دوری ہے۔ یہ مبارک مہینہ ہمیں اس ظلم عظیم سے توبہ کرنے اور قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ علّامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے:

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

روزہ

رمضان المبارک کی اہم ترین عبادت روزہ ہے جو ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۳ میں اس کی فرضیت کا حکم اس طرح دیا گیا ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو سکے۔''

روزہ کی فرضیت کا اصل مقصد حصولِ تقویٰ ہے۔ تقویٰ پرہیزگاری کا، گناہوں سے بچنے کا، نیکی کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح تقویٰ حُبِّ خدا کا نام بھی ہے اور خوفِ خدا کا بھی، بایں طور کہ اللہ تعالیٰ سے محبت عمل پر اُبھارتی ہے اور خوفِ خدا گناہ سے بچاتا ہے۔ چنانچہ ایسے روزہ کا حکم دیا گیا جو بندے کے اندر تقویٰ پیدا کر سکے۔ روزہ محض صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں، بلکہ یہ انسان کے ایک ایک عضو کا روزہ ہے۔ مثلاً دماغ غلط بات اور کام نہ سوچے، کان فضول بات، جھوٹ اور غیبت نہ سنے، زبان جھوٹ، غیبت، گالی گلوچ اور دل آزاری کرنے سے باز رہے۔ اس ضمن میں دو احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) صحیح بخاری کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَ شَرَابَهٗ)) (صحيح البخارى)

''جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((وَإِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ، فَإِنْ سَابَّهٗ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ: إِنِّي امْرُؤٌ صَائِمٌ)) (صحيح البخارى)

''جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو نہ اپنی زبان سے کوئی بری بات کہے اور نہ شور شرابہ کرے۔ اور اگر کوئی اس سے بدزبانی یا لڑائی کرے تو اسے چاہیے کہ کہے کہ مَیں روزے دار ہوں۔''

پھر روزہ کی ایک بہت اہم شرط یہ ہے کہ روزہ ایمان اور احتساب کی کیفیت کے ساتھ ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اُس سے اجر و ثواب کی امید ہو۔ ایسے ہی روزے داروں کو گناہوں کی معافی کی بشارت دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (متفق عليه)

''جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان اور اجر و ثواب کی امید کے ساتھ تو بخش دیے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔''

اعتکاف اور لیلۃ القدر

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں شبِ قدر کو تلاش کیا جائے اور ان راتوں میں نوافل، ذکرِ الٰہی اور قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن مجید میں ایک مکمل سورۃ 'القدر' ہے جس میں شبِ قدر کو ہزار مہینے سے افضل قرار دیا گیا۔ اسی شبِ قدر کی برکات کے حصول کے لیے نبی اکرم ﷺ اعتکاف کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ یہ عمل فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس شبِ قدر کی برکت کی وجہ بھی قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہے۔ اعتکاف کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''معتکف شوال کی چاند رات کو اپنے گھر نہیں لوٹتا مگر اس کے سارے گناہ معاف ہو چکے ہوتے ہیں۔''

ذکرِ الٰہی کا اہتمام

رمضان میں کثرت سے ذکرِ الٰہی کا اہتمام کرنا چاہیے، خاص طور پر کلمہ طیّبہ، درود شریف اور استغفار۔ جنّت کی طلب اور جہنم سے پناہ کی دعائیں کرنی چاہئیں۔ ذکرِ الٰہی کی فضیلت مسلّم ہے،

اس لیے صرف رمضان میں ہی نہیں' بلکہ ساری زندگی ذکر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ذکر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ ، وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ ، وَخَيْرٍ لَكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ ، وَخَيْرٍ لَكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ ، فَتَضْرِبُوْا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوْا أَعْنَاقَكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى! قَالَ: ذِكْرُ اللهِ تَعَالٰى)) (سنن الترمذی)

''کیا مَیں تمہیں تمہارے اعمال میں سے سب سے اچھا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے مالک کے ہاں بہتر اور پاکیزہ ہے' تمہارے درجات میں سب سے بلند ہے' تمہارے سونے اور چاندی کی خیرات سے بھی افضل ہے اور تمہارے دشمن کا سامنا کرنے یعنی جہاد سے بھی بہتر ہے درآنحالیکہ تم انہیں قتل کرو اور وہ تمہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: وہ عمل اللہ کا ذکر ہے۔''

دعا

دعا عبادت کا مغز اور مؤمن کا ہتھیار ہے۔ دعا ہی آسمان و زمین کا نور اور بلاؤں کے ٹالنے کا سبب ہے اور دعا کی تاثیر یہ بیان کی گئی ہے کہ دعا مانگنے والا اپنے دل میں ایک ٹھنڈک محسوس کرے اور اُسے محسوس ہو کہ اس کی دعا کی قبولیت کا اعلان ہوا ہے' جسے اس کے کانوں نے نہیں' دل نے سنا ہے۔

رمضان المبارک سارے کا سارا خاص طور پر دعاؤں کی قبولیت کا مہینہ ہے اور اس میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جو دعاؤں کی قبولیت کا نہ ہو' مثلاً روزہ دار کی دعا قبول کی جاتی ہے' افطار اور سحری کے وقت دعا قبول ہوتی ہے' فرض نمازوں کے بعد' ذکرِ الٰہی اور تلاوت کے بعد دعا قبول کی جاتی ہے۔ گویا سارا دن روزہ کی وجہ سے اور رات کو قیام اللیل کی بدولت دعا قبول ہوتی ہے۔

ہم رمضان المبارک کس طرح گزاریں؟

رمضان المبارک گزارنے کے حوالے سے دس اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ رمضان المبارک کی آمد سے پہلے مضبوط اور قوی ارادہ اور عزم کرلیں کہ مجھے اس رمضان سے پورا فائدہ اٹھانا ہے' ہوسکتا ہے کہ یہ رمضان میری زندگی کا آخری رمضان ہو۔

۲۔ رمضان کی آمد سے پہلے کاروباری معاملات' گھر کے ضروری کام اور عید کی تیاری وغیرہ کے کام پہلے ہی مکمل کرلیں تاکہ یکسوئی کے ساتھ روزہ اور قیام اللیل کا اہتمام کیا جاسکے۔

۳۔ نمازِ تراویح کے ساتھ ہونے والے دورۂ ترجمۂ قرآن اور خلاصۂ مضامینِ قرآن کے پروگراموں میں پابندی سے شرکت کی جائے اور کم از کم ایک مرتبہ قرآن مجید کی ناظرہ تلاوت کی جائے۔ اگر ترجمہ کے ساتھ ممکن ہو تو یہ بہت بہتر ہوگا۔

۴۔ دعاؤں اور ذکرِ الٰہی کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔

۵۔ روزہ کی حالت میں لغو اور فضول باتوں اور کاموں سے اجتناب' بالخصوص زبان کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''زبان کی بدولت مسلمان نیکی کی ایک فصل بوتا ہے جسے آخرت میں جنّت کی شکل میں کاٹے گا اور زبان ہی کی بدولت گناہ کی ایک فصل بوتا ہے جسے آخرت میں جہنّم کی شکل میں کاٹے گا۔''

۶۔ تمام نمازوں کا باجماعت اور کوشش کرکے تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ ادا کرنا۔

۷۔ زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ وخیرات' غریبوں کی امداد اور ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ اور ان کی خبر گیری جیسے دوسرے اعمال بجالانا۔

۸۔ اپنے آپ کو بدنظری سے بچانا۔ بدنظری وہ برائی ہے جو انسان کی قلبی و روحانی کیفیت اور حلاوت کو سلب کرلیتی ہے۔

۹۔ افطار اور سحری میں مناسب خوراک کا اہتمام کرنا' بہت پیٹ بھر کر کھانے سے اور چٹخارے دار کھانوں سے اجتناب کرنا۔

۱۰۔ شبِ قدر کی تلاش میں خاص طور پر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں قیام اللیل اور نوافل کا خصوصی اہتمام کرنا اور صدقہ فطر کی ادائیگی کا اہتمام کرنا۔ صدقہ فطر ایک طرف ہمارے روزہ کے دوران ہونے والی کوتاہیوں کا کفّارہ ہے تو دوسری طرف غریب اور مساکین کو ہمارے ساتھ عید کی خوشیوں میں شرکت کرنے کا معاملہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سارا رمضان المبارک پوری ایمانی کیفیت' ایمان و احتساب اور صحت و تندرستی کے ساتھ گزارنے اور اس ماہ میں وہ تمام اعمال ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کیا کرتے تھے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

فتنۂ دجّال اور درپیش چیلنجز

آصف حمید ٭

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

زیرِنظر موضوع اس قدر وسیع اور مختلف جہات پر مبنی ہے کہ جب مَیں اس کی تیّاری کرنے بیٹھا تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں سے شروع کیا جائے اور کہاں تک بات کو لے کر جایا جائے۔ لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ فی الحال جو مَیں نے سوچا ہے‘ وہ بخوبی آپ تک پہنچایا جاسکے۔

قصّہ آدم وابلیس سے سبق

اس سے قبل کہ ہم دجّال اور دورِ حاضر میں دجّالیت کے مظاہر پر بات کریں‘ ضروری ہے کہ ہم قصّہ آدم وابلیس کا خلاصہ اپنے دماغ میں تازہ کرلیں‘ کیونکہ اس واقعے کا بہت گہرا تعلق ان گزارشات سے ہے جو کہ مَیں آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔

قصّہ آدم وابلیس قرآن مجید میں سات مقامات پر آیا ہے جو کہ اس واقعہ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے‘ لیکن عموماً ایک قاری اس کو محض ایک واقعے کے طور پر پڑھ کر گزر جاتا ہے‘ اِلا ما شاء اللہ۔ جیسے کہ ایک واقعہ ہوا کہ تخلیقِ آدم کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام ملائکہ کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ تمام ملائکہ نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا‘ سوائے ابلیس کے۔ اس نے تکبّر اور حسد کے باعث سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے راندۂ درگاہ اور مردود قرار دیا۔ پھر ابلیس نے اللہ کی عزّت کی قسم کھائی کہ مَیں سب انسانوں کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ اس کے بعد اُس نے حضرت آدم اور حضرت حوّا (علیہما السلام) کو جنّت کے ایک درخت سے پھل کھانے پر ورغلایا جس کو کھانے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا۔ ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھالیا اور اس طرح ابلیس نے انہیں جنّت سے نکلوا دیا —— اور قصّہ ختم!! غور طلب بات یہ ہے کہ کیا یہ واقعہ محض

٭ ناظم شعبہ سمع وبصر‘ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور و تنظیم اسلامی

ایک قصّے کے طور پر پڑھنے کے لیے بیان کیا گیا تھا!

قرآن مجید کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ اس میں کوئی حرف بھی بے معنی یا غیر اہم نہیں‘ کجا یہ واقعہ جو سات بار بیان ہوا اور ہر بار کچھ مزید تفصیل کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس واقعہ کی اہمیت حضرت آدمؑ کی تخلیق سے روزِ قیامت تک ہے‘ اور ابتدا سے آخر تک خیر وشر کا معرکہ جاری ہے اور رہے گا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جونہی ہم اس واقعہ کو محض ایک قصّہ سمجھ کر گزر جاتے ہیں تو ہماری نگاہوں سے وہ معرکہ خیر وشر بھی اوجھل ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر آخرت میں جزا وسزا کا معاملہ ہونا ہے۔

اس واقعہ میں اہم ترین معاملہ جس کی طرف توجّہ مبذول کرانی مقصود ہے‘ یہ ہے کہ حسد اور تکبّر سے لبریز ابلیس کو جب اللہ تعالیٰ نے مردود قرار دے دیا تو ان دونوں کے مابین کیا کیا مکالمے ہوئے۔ ذیل میں وہ سات مقامات درج ہیں:

(۱) ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۡ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ (البقرۃ)

’’اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو! تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اُس نے انکار کیا اور تکبّر کیا‘ اور وہ کافروں میں سے ہوگیا۔‘‘

(۲) ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۵ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَــَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۸﴾ (الاعراف)

’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تجھے کس بات نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ اُس (ابلیس) نے کہا: مَیں اس سے بہتر ہوں‘ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو خاک سے پیدا کیا ہے۔ (حق تعالیٰ نے) فرمایا: تُو آسمان سے اتر‘ تجھ کو کوئی حق

حاصل نہیں کہ تُو آسمان میں رہ کر تکبّر کرے' سو نکل بیشک تو ذلیلوں میں سے ہے۔ اُس نے کہا کہ مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تجھ کو مہلت دی گئی۔ اُس نے کہا: بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو گمراہ کیا ہے مَیں قسم کھاتا ہوں کہ مَیں اُن کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر اُن پر حملہ کروں گا اُن کے آگے سے بھی اور اُن کے پیچھے سے بھی' اُن کی داہنی جانب سے بھی اور اُن کی بائیں جانب سے بھی' اور آپ اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا' جو شخص اُن میں سے تیرا کہنا مانے گا مَیں ضرور تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔''

(۳) ﴿قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (الحجر)

''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ وہ (ابلیس) بولا کہ مَیں ایسا نہیں کہ ایسے انسان کو سجدہ کروں جسے تو نے کالی اور سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹّی سے پیدا کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اب تُو بہشت سے نکل جا' کیوں کہ تو راندۂ درگاہ ہے۔ اور تجھ پر میری پھٹکار ہے قیامت کے دن تک۔ اُس (ابلیس) نے کہا: اے میرے ربّ! مجھے اُس دن تک ڈھیل دے کہ لوگ دوبارہ اُٹھا کھڑے کیے جائیں۔ اللہ نے فرمایا کہ اچھا تُو ان میں سے ہے جنہیں مہلت ملی ہے روزِ مقرر کے وقت تک۔ (ابلیس نے) کہا: اے میرے ربّ! چونکہ تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے مَیں بھی لازماً زمین میں ان کے لیے (نافرمانی کو) مزیّن کروں گا اور ان سب کو لازماً بہکاؤں گا' سوائے تیرے اُن بندوں کے جو منتخب کر لیے گئے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: ہاں! یہی مجھ تک پہنچنے کی سیدھی

راہ ہے۔ میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں' سوائے اُن گمراہ لوگوں کے جو تیری پیروی کریں۔ یقیناً ان سب کے وعدے کی جگہ جہنّم ہے۔''

(۴) ﴿قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ﴾ (بنی اسرائیل)

''اس (ابلیس) نے کہا کہ کیا مَیں اسے سجدہ کروں جسے تُو نے مٹّی سے پیدا کیا ہے! دیکھ لے اسے تو نے مجھ پر بزرگی تو دی ہے لیکن اگر مجھے بھی قیامت تک تُو نے ڈھیل دی تو میں اس کی اولاد کو' بجز تھوڑے لوگوں کے' اپنے بس میں کر لوں گا۔ ارشاد ہوا کہ جا ان میں سے جو بھی تیرا تابعدار ہو جائے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے جو پورا پورا بدلہ ہے۔ ان میں سے جن کو بھی تُو اپنی آواز سے پھسلا سکے تو پھسلا لے' اور تُو چڑھا لا ان پر اپنے سواروں کو اور اپنے پیادوں کو اور تُو ان کے ساتھ مشارکت کر مال اور اولاد میں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر۔ یقیناً شیطان ان سے وعدہ نہیں کرتا سوائے دھوکے کے۔ بلاشبہ میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا۔''

(۵) ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾﴾ (الکہف)

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا' یہ جنّوں میں سے تھا' اُس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔ کیا پھر بھی تم اُسے اور اُس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالانکہ وہ تم سب کے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کا کیا ہی برا بدلہ ہے!''

(۶) ﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا

يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ (طٰہٰ)

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا' اُس نے صاف انکار کر دیا۔ تو ہم نے کہا: اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے (خیال رکھنا) ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنّت سے نکلوا دے کہ تُو مصیبت میں پڑ جائے۔''

(۷) ﴿قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ ۣ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (صٓ)

''اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تُو اُسے سجدہ کرے جسے مَیں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا! کیا تُو گھمنڈ میں آ گیا ہے؟ یا تُو بڑے درجے والوں میں سے ہے؟ اُس (ابلیس) نے جواب دیا کہ مَیں اس سے بہتر ہوں' تُو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹّی سے بنایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ تُو یہاں سے نکل جا' تُو مردود ہوا۔ اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت و پھٹکار ہے۔ کہنے لگا: میرے رب! مجھے لوگوں کے اُٹھ کھڑے ہونے کے دن تک مہلت دے۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: تُو مہلت والوں میں سے ہے' متعین وقت کے دن تک۔ کہنے لگا: پھر تو تیری عزّت کی قسم! مَیں اُن سب کو یقیناً بہکا دوں گا۔ سوائے تیرے اُن بندوں کے جو چنیدہ اور پسندیدہ ہوں۔ فرمایا: سچ تو یہ ہے' اور مَیں سچ ہی کہا کرتا ہوں کہ مَیں تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے جہنّم کو بھر کر رہوں گا۔''

اگر ان ساتوں مقامات کی ترجمانی کی جائے تو ابلیس جس کو قیامت کے دن تک مہلت دی گئی ہے' کا کردار اور ٹارگٹ کچھ یوں نظر آتے ہیں:

۱۔ کردار: تکبّر کرنے والا' حسد کرنے والا' نافرمانی کرنے والا' نافرمانی پر ڈٹ جانے والا' انتقام لینے والا' انسان کا دشمن۔

۲۔ ٹارگٹ: اُس کا اصل ٹارگٹ جس پر اُس نے اللہ کی عزّت کی قسم کھائی ہے' یہ ہے کہ وہ بنی آدم کو گمراہ کرے گا اور یوں جہنّم میں بھجوا کر رہے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ درج ذیل کام کرے گا:

نیکی اور سیدھی راہ پر گھات لگائے گا۔ ہر طرف سے انسانوں پر حملہ کرے گا۔ لوگوں کو اللہ کا ناشکرا بنائے گا۔ دنیا کو مزیّن کر کے پیش کرے گا کہ لوگ نافرمانی کریں۔ لوگوں کو سیدھے راستے سے بہکائے گا۔ آدم کی اولاد کو اپنی آواز سے بہلائے گا' اپنے کارندوں سے ان کے ایمان پر حملہ کرے گا۔ حلال اور حرام کی تمیز ختم کر کے لوگوں کے مال اور اولاد میں مشارکت کرے گا۔ جھوٹے وعدے کرے گا اور دھوکے دے گا۔

عجیب معاملہ یہ ہے کہ ہم جب قرآن مجید پڑھتے ہیں تو اس واقعہ کو صرف ایک سرگزشت کی صورت میں پڑھ کر گزر جاتے ہیں۔ اس کے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں کہ ایک واقعہ ہوا اور ختم ہو گیا۔ اگر غور کریں تو اکثریت کے ذہن میں یہی بات ہوتی ہے کہ ہاں یہ ابتدائے آفرینش کا واقعہ تھا' جو ختم ہو گیا۔ بہت کم لوگ اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ ابلیس کا وہ چیلنج آج تک جاری ہے' اور قیامت تک جاری رہے گا۔ شیطان نے اللہ کی عزّت کی جو قسم کھائی تھی اس کی آج تک لاج رکھی ہوئی ہے۔ اُس نے یہ عہد پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' بلکہ وہ آگے سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اس واقعے کے حوالے سے ہمیں یاد رہنا چاہیے کہ نیکی اور بدی کا معرکہ پہلے دن سے چل رہا ہے۔ ابلیس نے اللہ ربّ العزت کو جو چیلنج کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے! یہ معرکہ خیر و شر حضرت آدمؑ سے قیامِ قیامت تک بپا ہے' جو وقت کے ساتھ تیز سے تیز تر ہو رہا ہے اور اپنے انجام کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اور ہماری نگاہوں کے سامنے خیر و شر کی ایک جنگ چل رہی ہے' جس کا ہمیں ہر روز سامنا ہوتا ہے۔ لازم ہے کہ ہمیں اس کا پورا شعور ہو کہ ہم اُس معرکے کے دو فریقین میں سے کہیں ایک طرف کھڑے ہیں۔ یا تو شیطان کی طرف ہیں یا رحمٰن کی طرف! اسی لحاظ سے قرآنِ مجید میں دو ہی گروہوں کا ذکر آیا ہے: حزب اللہ اور حزب الشیطان۔

اگر ہم تھوڑا سا مزید تجزیہ (analysis) کریں تو ہمیں حزب اللہ اور حزب الشیطان کے اندر دو دو گروہ اور بھی نظر آئیں گے۔ حزب اللہ میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو حقیقی طور پر اس معرکۂ خیر وشر کو سمجھتے ہیں اور ابلیسی ایجنڈے سے شعوری طور پر آگاہ رہتے ہیں۔ وہ خیال رکھتے ہیں کہ کہیں اَنجانے میں ان سے وہ اُمور سرزد نہ ہو جائیں جن کی پاداش میں ان کا شمار حزب الشیطان میں ہو جائے۔ یہ لوگ دنیا کی چکاچوند اور ترقی کو خیر وشر‘ جائز و ناجائز اور حلال وحرام کے پیمانے پر پرکھتے ہیں۔ اندھا دھند جدیدیت کی طرف نہیں بھاگے چلے جاتے بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کو کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

البتہ بہت بڑی اکثریت ایسے غیر شعوری نیکوکاروں کی بھی ہے جو دین پر واجبی سا عمل پیرا ہیں۔ پس خاندانی روایات ہیں‘ خاندانی شرافت ہے‘ کچھ اَخلاقیات پر عمل پیرا ہونا ہے‘ کچھ بُری روایات سے بچنا ہے۔ سب کچھ حقوق العباد ہی ہیں۔ باقی دنیا کے اندر جو ہو رہا ہے اس کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ کیا کریں جی‘ پس دنیا کی نئی اَقدار ہیں۔ آخر دنیا کے ساتھ بھی تو چلنا ہے۔ مذہب تو انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ستر وحجاب پُرانے دَور کی باتیں تھیں‘ اب تو زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ سُود سے بچنا اور صرف حلال کمائی پر اکتفا اب ممکن نہیں‘ وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ نماز پڑھنی چاہیے‘ روزے رکھنے چاہئیں‘ حج اور قربانی بھی کر لو‘ زکوٰۃ بھی مارے باندھے کو دے دی۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔ اس بات سے انہیں کوئی سروکار نہیں کہ ابلیس نے اللہ کے سامنے جو دعویٰ کیا تھا وہ اس کی تکمیل میں مسلسل لگا ہوا ہے۔ اس کا ایجنڈا کیا ہے اور اس ایجنڈے کی تکمیل میں کون کون سی طاقتیں شب و روز ایک کیے ہوئے ہیں! سیاسی سطح پر سیکولرازم‘ معاشی سطح پر سودی نظام اور معاشرتی سطح پر بے حیائی‘ عریانی اور فحاشی کا نظام انسانیت پر مسلّط کیا جا رہا ہے۔ دنیا تیزی سے شیطانی ایجنڈے کی تکمیل میں آگے بڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس چیز کو وہ کبھی شیطان کا حملہ نہیں سمجھتے یا جسے ہم دجالیت کہتے ہیں‘ اُس سے نہیں جوڑتے۔ یہ معرکہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ برپا ہے اور المیہ یہ ہے کہ ہماری قوم کی اکثریت کو اس سے شعوری طور پر آگاہی حاصل نہیں ہے۔

اسی طرح حزب الشیطان کا بھی ایک لائٹر ورژن ایسا ہے جس میں لوگ کہتے ہیں بس ٹھیک رہو‘ یہ دین و مذہب کوئی شے نہیں‘ آخرت کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ جیسا نظریہ چاہے

اختیار کر لو۔ حلال وحرام بھی کوئی چیز نہیں‘ اصل بات تو پسند ناپسند کی ہے۔ ہفتے میں پانچ دن جانوروں کی طرح کام کرو اور ویک اینڈ عیش وعشرت میں گزارو۔ کچھ اَخلاقیات ہونے چاہئیں‘ آپس کے معاملات کو ٹھیک رکھو‘ حقوقِ انسانی کا خیال رکھو‘ جانوروں کے حقوق کا بھی خیال کر لو۔ مغرب پورا بھرا پڑا ہے اس سے۔ زندگی کے معاملات کا کوئی تعلق اللہ اور اُس کے قانون سے نہیں‘ کوئی تعلق آخرت سے نہیں۔ یہ لوگ غیر شعوری طور پر شیطان کی راہ پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ حزب الشیطان کا ہراول دستہ وہ لوگ ہیں جو واقعی شیطان کے نظام اور اس کے ایجنڈے کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کام دنیا میں اللہ سے بغاوت پر مبنی نظام کو مسلط کرنا‘ سودی معیشت کے ذریعہ سے پوری دنیا کو اپنے قابو میں کرنا اور اسی کے ذریعہ سے دنیا کے تمام وسائل پر قبضہ کرنا‘ عریانی اور فحاشی کے ذریعہ سے انسان کو جانوروں سے بدتر کر دینا اور اسے اس سطح تک لے جانا جس کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف:۱۷۹) ’’وہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔‘‘ (جاری ہے) ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

میرا گھر میری ذِمّہ داری

انجینئر سید نعمان اختر*

جناب انجینئر سید نعمان اختر صاحب (نائب ناظم اعلیٰ، جنوبی پاکستان زون وصدرِ انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی) نے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ نومبر ۲۰۲۱ء بمقام بہاولپور میں رفقائے تنظیم اسلامی اور احباب کے لیے نہایت بصیرت آموز اور پند و نصائح پر مبنی خطاب فرمایا۔ رفقاء و احباب کی دلچسپی اور افادۂ عام کے لیے اس خطاب کو ترتیب و تسوید کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

تنظیم اسلامی اقامتِ دین کی علمبردار ہے۔ قرآن حکیم اس کی دعوت و تربیت کا مرکز و محور ہے۔ عالمی سطح پر بھی اور ہمارے اعزّہ و اقارب اور حلقہ احباب میں بھی ہماری پہچان داعیٔ قرآن اور بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے شاگردوں کی حیثیت سے ہے۔ تنظیم سے وابستہ ہر رفیق اپنی حیثیت میں اور اپنے دائرۂ اختیار میں اقامتِ دین کی دعوت و تبلیغ میں مصروف ہے، اور الحمدللہ اس کے امید افزا نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔

ذرا اپنے آپ کو جانچنے کی کوشش کریں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مَیں دعوتِ قرآنی اور انقلابی فکر سے پوری دنیا کو تو منور کر رہا ہوں لیکن میرا اپنا گھر اس نور سے منور نہیں! مَیں اس انقلابی فکر سے جوڑنے کے لیے احباب پر تو کام کر رہا ہوں، ان کی منتیں کر رہا ہوں لیکن میرے گھر کا کوئی فرد اس فکر سے روشناس نہیں، اس مشن میں میرا دست و بازو نہیں۔ اور مجھے اس لحاظ سے ان کی فکر بھی نہیں۔ ایسے میں بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ذرا سخت الفاظ اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے جب ایک موقع پر انہوں نے فرمایا تھا: ''آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اپنی شخصیت کی پروجیکشن کے لیے، آپ اپنے نام کو نمایاں کرنے کے لیے اور ہوسِ اقتدار کے اندر مبتلا ہو کر کر رہے ہیں۔'' اقامتِ دین کا ہر داعی ان الفاظ پر غور کر کے اپنا جائزہ لے، تاکہ اپنا مقام اور اپنی

جِدّ و جُہد کی صحیح سمت اس کی نظروں کے سامنے آ جائے۔

گھر والوں کی تربیت ہمارا دینی بلکہ اخلاقی فریضہ بھی ہے۔ اس پر ہمیں خصوصی توجہ دینی ہے۔ رفقاء کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ تنظیم اسلامی میں ہماری پرورش ذمہ داریوں میں ہوئی ہے۔ الحمدللہ ہمیں کسی منصب یا عہدے کا شعور نہیں دیا گیا۔ چنانچہ انقلابی دوست جو اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اہم ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں ان کے ذہن میں یہ بھی مستحضر رہے کہ ایک اہم ذمہ داری میرا اپنا گھر بھی ہے۔ گھر والوں کی اصلاح اور انہیں اقامتِ دین کا شعور دینا بھی میری ہی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کے سامنے مَیں مسئول بھی ہوں۔

اس حوالے سے چند بنیادی باتیں ہیں جن کا ہمیں ادراک ہونا ضروری ہے:

گھر کا مقصد

پہلی اہم چیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس گھر میں پیدا کیا ہے اور اس میں جس حیثیت سے بھی ہم اپنا کردار ادا کر رہے ہیں، اس کا مقصد خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ (النحل:۸۰)

''اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا ہے''

بازاروں میں ایک تختی ملتی ہے جو مغرب کی اختراع ہے، جس پر لکھا ہوتا ہے ''ہوم سویٹ ہوم'' (Home Sweet Home)۔ یہاں غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کیا محض یہ تختیاں آویزاں کرنے سے گھر سویٹ ہوم بن جائیں گے؟ کیا ہماری اس خوش فہمی سے ہمارے گھر امن و سکون کا گہوارہ بن جائیں گے؟ ہرگز نہیں! یہ خیال ہے جو محال ہے۔ سکون و راحت کی فضا قائم کرنے کے لیے اصل چیز گھر کے ہر فرد کا اپنے فرائض کو پہچاننا اور اپنے کردار و عمل سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔ تب ہی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ہمارے گھروں میں سکون و عافیت کا ماحول پیدا ہو جائے۔

آج مغرب نے حقوق کی ایک لمبی فہرست ہمارے ہاتھوں میں تھما دی ہے جس پر ہر شخص اپنے حقوق کا طلب گار ہے جبکہ اپنے فرائض سے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس دینِ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کے ہاتھ میں فرائض کی فہرست ہو۔ اس طرح جب وہ

اپنے فرائض ادا کرے گا تو لامحالہ دوسروں کے حقوق ادا ہو جائیں گے۔ یہ وہ فطری ترتیب ہے جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

شوہر اور بیوی کے تعلق کا مقصد

گھر شوہر اور بیوی کے تعلق سے بنتا ہے۔ قرآن حکیم میں زوجین کے تعلق کو سکون و راحت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾

(الروم:۲۱)

''یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری نوع میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم سکون حاصل کرو۔''

نکاح ایک ایسی گرہ اور ایسا معاہدہ ہے جو پوری زندگی کے لیے قائم ہوتا ہے۔ اس بندھن کا مقصد یقیناً جنسی جذبے کی تسکین بھی ہے، جس کو نسلِ انسانی کے تسلسل کے لیے انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے، لیکن جائز راستے کے تعین کے ساتھ۔ اس کے حصول کے لیے آج مغرب بے راہ روی کی زندگی کے تحت در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ مختلف کلبوں اور حرام کاریوں کے اڈوں پر جا کر اپنی جنسی پیاس بجھا رہا ہے۔ نفسِ امّارہ کے مُنہ زور گھوڑے کو قابو میں نہ رکھا جائے تو انسانی معاشرہ اسی طرح کی گندگی اور تعفن کی آماج گاہ بن جاتا ہے جس کا مظہر آج مغرب بنا ہوا ہے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ زوجین کا پوری زندگی کا یہ تعلق صرف جنسی جذبہ کی تسکین پر منحصر نہیں، بلکہ اس کو نبھانے کے لیے ذہنی اور قلبی سکون بھی درکار ہے جو صرف اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی ہی سے ممکن ہے۔

موضوع کی اہمیت

اس موضوع کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے قرآن و سُنّت سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے ان میں سے چند نکات درج ذیل ہیں:

(۱) گھر والوں کی ایسی تربیت کرنا کہ جس کے ذریعہ سے وہ جہنّم کی آگ سے بچ سکیں۔ یہ اللہ ربّ العزت کا حکم ہے۔ سورۃ التحریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (التحریم:۶)

''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنّم کی آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں''

اِس آیت کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ گھر والوں کو جہنّم سے کیسے بچائیں، تو آپؐ نے فرمایا:

((تأمرونهم بما يحبه الله وتنهونهم عما يكره الله)) (أخرج ابن مردويه)

''جو باتیں اللہ کو محبوب ہیں اُن کی گھر والوں کو تلقین کرو اور جو باتیں اللہ کو ناپسند ہیں اُن سے گھر والوں کو روکو۔''

اللہ تعالیٰ نے ہماری ذمہ داری صرف یہ نہیں لگائی کہ ہم ساری جِدّ و جُہد اور بھاگ دوڑ اپنے اہل خانہ کے پیٹ کی آگ بجھانے میں ہی صَرف کر دیں اور انہیں جہنّم کی آگ سے بچانے کی کوئی سعی و جُہد نہ کریں۔

(۲) روزِ قیامت گھر والوں کے حوالے سے ہم سے سوال ہونا ہے کہ اُن کی تربیت کیسے کی!

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

((أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (صحيح البخاري)

''آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے، اور اس کے ماتحت رعیت کے بارے میں (روزِ قیامت) اس سے سوال ہونا ہے۔''

ذمہ داری کی حساسیت کا اندازہ اس روایت سے بھی ہوتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنّت کی خوشبو سے محرومی کی وعید سنائی ہے:

((مَا مِنْ عَبْدٍ اسْتَرْعَاهُ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيحَةٍ إِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ)) (متفق عليه)

''اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو کسی رعیت کا حاکم بنایا اور اُس نے خیر خواہی کے ساتھ اس کی حفاظت نہیں کی تو اس کو جنّت کی خوشبو تک نہیں پہنچے گی۔''

اصل میں یہ وہ دو کیفیات ہیں جو نتیجہ کے طور پر قیامت کے دن ظاہر ہوں گی۔ ایک کیفیت وہ ہے جس میں اہلِ جنّت کا قول نقل کیا گیا ہے:

﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶﴾ (الطور)

''وہ (اہلِ جنّت) کہیں گے ہم دنیا میں اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے۔''

یہ خوف وہ حساسیت ہے کہ کہیں میری بیوی بے پردہ ہو کر تو گھر سے نہیں نکل رہی۔ مَیں اپنے بچوں کی تربیت دینی خطوط پر کر رہا ہوں کہ نہیں؟ کیا مَیں اپنی اولاد کو اُمّت کے لیے ایک فعال اور دینی مزاج کا حامل بنا پایا ہوں کہ نہیں؟ یہ ہے ایک نتیجہ جو مستقبل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم!

اس کے برعکس ایک نتیجہ وہ ہے جس کا نقشہ قرآن مجید میں اہلِ جہنّم کی روش کے طور پر بیان کر دیا گیا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝۱۳﴾ (الانشقاق)

''بے شک وہ (اہلِ جہنّم) اپنے گھر والوں میں مست رہتے تھے۔''

انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی کہ ان کے بچوں کا اٹھنا بیٹھنا کہاں ہے! وہ کس سوسائٹی میں اپنے زیادہ اوقات گزار رہے ہیں' کیا تعلیم حاصل کر رہے ہیں' بیوی کس طرح سے بے پردہ ہو کر گھر سے باہر جا رہی ہے! اس کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ بہرحال ہمیں اپنے گھر کا تجزیہ کرنا چاہیے کہ مَیں کون سا نتیجہ اپنے لیے مرتّب کر رہا ہوں۔

(۳) ہمارا اصل خسارہ دنیا کا نہیں بلکہ آخرت کا ہے۔ آخرت میں خسارہ پانے والے لوگوں کی نشان دہی قرآن حکیم اس طرح کرتا ہے:

﴿اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۴۵)

''بے شک اصل خسارہ پانے والے تو وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا۔''

ایسے لوگ مجرم بن کر اللہ کی عدالت میں پیش ہوں گے جہاں اُن کی آرزو یہ ہوگی کہ اپنی نجات کے لیے گھر والوں کو بطورِ فدیہ دے دیں:

﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴﴾ (المعارج)

''اُس روز مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں

دے دے اپنے بیٹوں کو' اور اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو' اور اپنے کنبے کو جو اُسے پناہ دیتا تھا' اور روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو' پھر یہ (فدیہ) اس کو بچا لے!''

اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!

تربیت کے ذیل میں چند باتیں

اس موضوع کی اہمیت و حساسیت کو سمجھنے کے بعد تربیت کے ضمن میں چند اہم باتیں قابلِ توجّہ ہیں:

دنیا کی حقیقت واضح کرنا

گھر والوں کی تربیت کے ضمن میں بنیاد یہ ہے کہ کیا مَیں نے اس دنیا کی اصل حقیقت ان پر واضح کی ہے یا نہیں۔ کیا مَیں اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان مبارک کو گھر والوں کے اندر اُتار پایا ہوں کہ:

((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ)) (رواه الترمذی)

''اس دنیا کی حقیقت اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔'' (ترمذی)

رسول کریم ﷺ نے بکری کے بچے کی مثال بھی دی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ راہ چلتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے بکری کا ایک مرا ہوا بچہ دیکھا جس کے کان کٹے ہوئے' پیٹ پھولا ہوا اور اس میں سے بو آ رہی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابۂ کرامؓ سے دریافت فرمایا: ''تم میں سے کون اسے ایک درہم میں خریدے گا؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا کہ حضور اس مرے ہوئے بچے کو ایک درہم میں کون خریدے گا! اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جس طرح تمہاری نظر میں اس مرے ہوئے' کان کٹے ہوئے اور پیٹ پھولے ہوئے بچے کی کوئی حیثیت نہیں اس سے کہیں کم تر اللہ کی نگاہ میں اس دنیا کی حقیقت ہے۔'' (مسلم)

ذرا سوچیے کہ یہ باتیں صرف عوام الناس کے لیے ہیں یا ہم اپنے گھر والوں کے ذہنوں میں بھی دنیا کی یہ حقیقت واضح کر پا رہے ہیں؟ ہم انقلابی فکر رکھنے کے دعوے دار اگر خدانخواستہ

خود ہی قیمتی قالین، مہنگے ڈنر سیٹ اور شوپیسز کے دلدادہ ہو جائیں، ہماری گاڑی اور ہمارے موبائل سالانہ بنیادوں پر تبدیل ہوتے رہیں تو پھر ہم کیسے اپنے گھر والوں کے طرزِ زندگی میں اس دنیا کی اصل حقیقت اور اس کی بے ثباتی اجاگر کر پائیں گے؟ اس پہلو پر ہمیں سنجیدگی سے توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے لیے ہر لحاظ اور ہر زاویے سے رسول اکرم ﷺ ہی اسوہ ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ چٹائی پر لیٹنے کی وجہ سے آپؐ کی کمر مبارک پر نشان پڑ گئے تھے، صحابۂ کرامؓ یہ منظر دیکھ کر لرز گئے اور بے چین ہو کر دریافت کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کہاں وہ قیصر و کسریٰ کے عیش و آرام اور آپؐ کی کمر مبارک پر یہ چٹائی کے نشان؟ کیا ہم آپؐ کے لیے کسی آرام دہ گدے کا انتظام کر دیں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا لِي وَمَا لِلدُّنْيَا ، مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا)) (رواه الترمذي)

''میرا تمہاری دنیا سے کیا کام! اس دنیا میں میرا قیام ایک مسافر کی طرح ہے جو کسی درخت کے سائے میں آ کر تھوڑا آرام کرتا ہے اور پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑتا ہے۔''

مسافر کی نگاہ اس کی منزل کی طرف ہی ہوتی ہے، اور ہماری منزل متعین ہے۔ یہاں احساسِ زیاں پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تو دنیا میں مسافر کی طرح رہیں، تکلیفیں برداشت کریں، ہدایت کا خزانہ پہنچا کر جائیں، جبکہ ان کی محبّت کے دعوے دار دنیا کی رعنائیوں میں مست رہیں! رسول اللہ ﷺ کے اپنے گھر کا حال تو یوں ہے کہ حجرے میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ کھولتے تو دیواروں سے ٹکراتے اور اوپر اٹھاتے تو چھت سے جا لگتے۔ حجرے کے دروازے پر پردے کے لیے کمبل لٹکے ہوتے تھے۔ کئی کئی دن چولہا نہ جلنے کی وجہ سے چولہے میں گھاس اُگ آتی، اور کتنے ہی دن فاقوں میں گزر جاتے۔ یہ تھے رسول کریم ﷺ کی حیاتِ طیّبہ کے روز و شب، لیکن شانِ بندگی دیکھیں کہ پھر بھی آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ دعا نکل رہی ہے:

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّ اَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواه الترمذي)

''یا الٰہی! مجھے مسکین زندہ رکھ، حالتِ مسکینی میں ہی موت عطا فرما اور مساکین کے ساتھ

ہی قیامت میں مجھے اٹھا۔'' (ترمذی)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی درجے میں ہمارے اندر بھی یہی کیفیت پیدا فرما دے کہ ہم خود بھی دنیا کی اس بے ثباتی سے پوری طرح آگاہ ہوں اور اپنے گھر والوں کے اندر بھی اس کا صحیح شعور اجاگر کر پائیں۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ اگر ہم نے اس دنیوی زندگی کی چیک لسٹ میں آخرت کو سرفہرست رکھا ہوا ہے تو اس کی بنیاد پر ہماری زندگی استوار ہوگی اور اگر اس پر دنیا سرِفہرست لکھ دی ہے تو اسی کے زیرِ اثر ہماری زندگی کا لائحہ عمل بنے گا۔

غمی و خوشی

خوشی اور غمی اس دنیا کا لازمی حصّہ ہیں۔ ہم ایسی خوش نصیب اُمّت ہیں کہ ان کیفیات کے لیے بھی ہمارے سامنے رسول کریم ﷺ بہترین نمونہ ہیں۔ ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھیے کہ وہ کون سا غم تھا جس سے اللہ کے رسول ﷺ نہ گزرے ہوں! یتیمی آپؐ نے دیکھی۔ والدہ کی وفات کے صدمے سے آپؐ دوچار ہوئے۔ اوائل عمر میں دادا ساتھ چھوڑ گئے۔ شریک حیات حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے وصال کا غم آپ کو سہنا پڑا۔ دو بچیوں کی طلاق کا دکھ آپؐ کو اپنی زندگی ہی میں برداشت کرنا پڑا۔ بیٹے کم سنی میں وفات پا گئے۔ صحیح بخاری میں ذکر ہے کہ اپنے صاحب زادے سیدنا ابراہیم کو نزع کے عالم میں دیکھ کر نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے لیکن آپ ﷺ نے فرمایا:

''ابراہیم ہم تجھے اللہ کے فیصلے سے بچا نہیں سکتے۔'' اور ''آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل مغموم ہے لیکن زبان سے ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔''

غیر متزلزل صبر و ثبات اور ہدایتِ کاملہ کا یہ کیسا بہترین سبق ہے جو محض ایک جملے سے حاصل ہوتا ہے۔ گھر والے بھی اس موقع پر موجود ہیں مگر صبر کا دامن کسی سے نہیں چھوٹا۔

آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اور تربیت کا یہ ماحول ہمارے گھروں سے رخصت ہو چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب گھروں سے میت اٹھانے کا موقع ہوتا ہے تو خواتین سینہ کوبی اور بین کرتی نظر آتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سُنّت کی روشنی میں تسلیم و رضا کی اس کیفیت کو ہمیں اپنی ذات میں اور اپنے اہل خانہ کے اندر بھی پیدا کرنے کی حتی المقدور فکر کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے مولانا محمد علی جوہر کا وہ طرزِ عمل تسلیم و رضا کا اعلیٰ نمونہ ہے جب تحریک

کے دوران ان کو جیل کاٹنی پڑی۔ دورانِ اسیری پہلی بیٹی کا ٹی بی سے انتقال ہوگیا۔ دوبارہ جیل گئے تو دوسری بیٹی بھی اسی موذی مرض میں مبتلا ہوگئی۔ بیٹی نزع کی کیفیت میں ہے اور خود جیل میں قید کاٹ رہے ہیں۔ گھر جا نہیں سکتے' لہٰذا حالتِ اسیری میں ہی اپنی بچی کو تسلیم و رضا میں ڈوبے چند اشعار لکھ کے بھیج دیتے ہیں:

مَیں تو مجبور سہی اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے مَیں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دلِ مؤمن ہی وہ کیا
جو ہر اِک حال میں اُمید سے معمور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اصل غم تو آخرت کا غم ہے' اصل خوشی بھی آخرت کی خوشی ہے۔ اس دنیا کے غم اور یہاں کی خوشیاں عارضی ہیں۔ اَسلاف کی مائیں' اُمّہات المومنین کی آنکھوں سے بھی آنسو بہے تھے۔ اماں عائشہ ؓ کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''عائشہ کیوں رو رہی ہو؟'' عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! جہنّم کی ہولناکیاں ذہن میں آگئیں تو آنسو بے قابو ہو گئے۔

آنسو تو ہمارے گھروں کی خواتین کی آنکھوں سے بھی جا رہی ہوتے ہیں مگر کسی فلم یا ڈرامے کے غمگین منظر (sad scene) یا غم انگیز گانا سن کر۔ اس صورتِ حال میں تو بعض اوقات مَرد بھی رو پڑتے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون! یہی آنسو اگر آخرت کی فکر میں بہائے جائیں' اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے رب کے حضور آنسوؤں کا یہ نذرانہ پیش کیا جائے تو انسان کا بیڑا ہی پار ہو جائے۔ اللہ پاک ہم سب کو اس کا صحیح فہم عطا فرمائے!

ہمارے دین میں خوشیاں منانے (celebrate کرنے) کے حوالے سے بھی ہدایات موجود ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے' اس نے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ حضرت فاطمہ ؓ کی شادی کے سلسلے میں جب حضرت علی ؓ کا پیغام آیا تو رسول مکرم ﷺ نے فرما یا کہ مجھے اپنی بچی سے پوچھ لینے دو۔ یہاں ایک باپ ہونے کے باوجود اپنی مرضی مسلط نہیں کی

گئی' لیکن بنتِ محمد ﷺ نے بھی شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں۔ آج کی بچیاں کیسے بے باکی کے ساتھ آنکھیں ملا کر اس موضوع پر گفتگو کرتی نظر آتی ہیں' اِلا ماشاء اللہ! نکاح منعقد ہو گیا' چھوہارے تقسیم ہوئے' اُمّ ایمن حضرت فاطمۃ الزہراء ؓ کا ہاتھ تھام کر حضرت علی ؓ کے حجرے میں چھوڑ آئیں۔ آج اگر ہم ایک انقلابی فکر رکھنے والوں کے ہاں ولیمے کے موقع پر کھانوں میں اسراف دیکھیں تو ذرا سوچیں کہ اس طرح کی روش اختیار کر کے ہم کس منہ سے کسی اور کو سادگی اور تہذیب کا درس دیں گے! اس کے علاوہ وقت کی پابندی کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔ دیر سے آنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ ان حالات میں جب ہم وقت کی اہمیت کا احساس سورۃ العصر کی روشنی میں بیان کریں گے تو کسی پر کیا اثر ہوگا؟

اصل میں ایک خاموش تبلیغ ہم اپنے طرزِ عمل سے بھی کرتے ہیں اور ہمارا یہ انداز ہی دوسروں کے لیے بگاڑ اور بناؤ کا سبب بنتا ہے۔ ہمیں اس نکتے کی حساسیت کا ادراک ہی نہیں ہوتا۔ بانی محترمؒ نے بھی اپنے بچوں اور بچیوں کی شادیاں کی تھیں۔ کیا وہ ہمارے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں؟ ان کے طریقہ کار کو دیکھ کر کالم نویسوں نے ''پاکستان ٹائمز'' اور دیگر اخبارات میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا کہ ''ایک ٹن وعظ کے مقابلے میں ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوا کرتا ہے۔''

بچوں کی تربیت

بچوں کی تعلیم کا بندوبست ہماری ذمہ داری ہے۔ علم کے حصول پر کلام سب سے زیادہ دین اسلام نے کیا ہے۔ تعلیم ضرور دلوائیں لیکن ایسے نہیں کہ نصابی معرکے تو سر کیے جائیں اور کردار سازی کی طرف کوئی توجہ نہ ہو۔ نوجوانوں میں جو جفاکشی' بہادری' دریا دلی اسلام دیکھنا چاہتا ہے وہ سرے سے ہماری نئی نسل میں نظر ہی نہ آئے۔ یہ صورت حال ہمارے مستقبل کے لیے نہایت بھیانک ہے۔ ہمارا ماضی تو اتنا تابناک ہے کہ ایک سترہ سالہ نوجوان محمد بن قاسمؒ سندھ کو فتح کر کے اسلام کا دروازہ کھولتے ہیں۔ جماعتی زندگی تو انقلابی فکر رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مدد و معاون ہے۔ گھریلو اسرہ کی ترغیب اسی اجتماعیت سے ملتی ہے۔ ہمارے بچے انقلابی فکر میں رنگے نظر آنے چاہئیں۔ اس کو مزید مؤثر کرنے کے لیے بانی محترمؒ اور امیر محترمؒ کے ویڈیوز دکھانے کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق مواد فراہم کرنا چاہیے اور بچیوں کے لیے ان کی افتادِ طبع کے مطابق

درس وتدریس کا معاملہ ہونا چاہیے۔ ہماری بچیوں کو نئے گھر کی زینت بننا ہے‘ اس لیے ان کی کردار سازی اسلامی خطوط پر اور شرم وحیا کی تعلیم کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے۔ اگر لڑکی کو معاملہ فہمی کی تربیت نہیں دی گئی تو سسرال میں پیچیدگیاں لاحق ہوسکتی ہیں۔ آج کل سرعت کے ساتھ طلاقوں کا سلسلہ معاشرے کے لیے تشویش ناک بنا ہوا ہے۔ زوجین نے طلاق کو گڑیا گڈے کا کھیل بنا رکھا ہے۔ رفیق تنظیم کی حیثیت سے اس حساس پہلو کی طرف بھی خصوصی توجّہ کی ضرورت ہے۔

صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ ماں بیٹی کو یہ سبق سکھاتی ہے کہ سسرال جاتے ہی شوہر کو اپنے قابو میں کرنا ہے اور ساس سسر سے الگ کر کے نئے گھر کا تقاضا کرنا ہے۔ اللہ پاک سب کی بیٹیوں‘ بیٹوں اور دونوں خاندانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے کہ وہ اس رشتے کی نزاکت کو سمجھیں۔ خاص طور پر بچیوں کو حیا کے زیور سے آراستہ کریں۔ شادی بیاہ کے مواقع پر انتہائی افسوس ناک صورتحال ہوتی ہے کہ نوعمر بچیوں کو بغیر آستین (sleeveless) لباس پہنا کر لایا جاتا ہے۔ اس تشویش ناک صورتِ حال میں ایک بڑا کردار ٹیلی ویژن کے علاوہ موبائل اور انٹرنیٹ کا بھی ہے۔ اس حوالے سے ایک دردمند شخص نے بڑا اثر انگیز تبصرہ لکھا ہے جو ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے:

’’گھروں میں موجود بچے بظاہر تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن درحقیقت وہ اغوا ہو چکے ہیں۔ دروازے توڑ کر‘ دیواریں پھلانگ کر‘ گھروں میں گھس کر آپ کے بچوں کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ آپ کا ٹی وی‘ لیپ ٹاپ‘ موبائل و دیگر چھوٹی بڑی سکرینیں آپ کے بچوں کے دماغ پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ان کے دل کو سیاہ اور پراگندہ کیا جا رہا ہے۔ ان کے کان اور آنکھیں حیا سے عاری اور مادر پدر آزاد بنائی جا رہی ہیں۔ گویا ان کے اعضاء کاٹے جا رہے ہیں۔ اب یہ صرف مسخ شدہ نعشیں ہیں۔ بچوں کا چہرہ سامنے ہونا ہی ان کا موجود یا محفوظ ہونا نہیں کہلاتا۔ بچیوں کے سروں پر سے پردہ سرک کر بدن سے بھی جان چھڑانے کے چکروں میں ہے۔ اب یہ سر پر پردہ تک کا بوجھ برداشت کرنے کی متحمل نہیں رہیں۔

وہ گھر چلانا اور گھر بنانا چھوڑ رہی ہے۔ وہ باہر کی دنیا کی اسیر ہو چکی ہے۔ بچے ہونے کے باوجود مائیں بے اولاد کی جا رہی ہیں۔ آج کی بچیاں کل کی ماں بننے کے لائق نہیں چھوڑی جا رہیں۔ انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر بانجھ کیا جا رہا ہے۔ ہم بچوں کو اپنے ہاتھوں سے بھاری فیس دے دے کر اس تہذیب کے حوالے کر رہے ہیں‘ وہ تہذیب کہ

جس نے آپ سے آپ کا خالق چھین لیا‘ اور آپ کی آنے والی نسلیں بھی۔

یہ بچے نہیں‘ اگلی نسل کے والدین اغوا ہو رہے ہیں۔ یہ اغوا شدہ بچے کل کو کس طرح کے ماں باپ ہوں گے‘ اس کا تصور بھی بھیانک ہے۔ جب کردار مسخ کر دیے جائیں‘ جب افکار کچل دیے جائیں‘ جب تہذیب ماردی جائے‘ نسلیں اغوا ہو جائیں تو یہ ہوتی ہے kidnapping۔ یہ ہوتے ہیں اصل missing persons جو نظروں کے سامنے ہو کر بھی کسی اور کے پیروکار ہوں۔ تو فکر ہونی چاہیے‘ یہ فکر ابھی کیجیے اور جان رکھیں کہ جو آپ کے پاس ہے وہ آپ کے ساتھ نہیں۔‘‘

ماؤں کا کردار

ماں کا کردار اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب بچہ ابھی رحمِ مادر میں ہی ہوتا ہے۔ ماں کا مثبت کردار بچے پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ یہاں ہماری اَسلاف کی ماؤں کا حوالہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری ہوگا۔ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا ایک جلیل القدر صحابیہ تھیں۔ جنگ قادسیہ کا واقعہ ہے‘ اگلے دن غزوہ ہونا ہے۔ چار نوجوان بیٹوں کو جنگ کے لیے تیار کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں: ’’بچو! کل جب تم جنگ کرو تو اللہ کی راہ میں دیوانہ وار تلوار چلانا۔ اگر ہو سکے تو عین آتش دان جنگ میں کود پڑنا اور دشمن کے سپہ سالار پر ٹوٹ پڑنا اور اس کو ختم کر دینا۔ اگر تم کامیاب ہو گئے یعنی واپس آ گئے تو کامیابی اور اگر واپس نہ آئے‘ شہید ہو گئے تو یہ اس سے بھی بڑی کامیابی ہوگی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں جو بھی لازوال نعمتیں موجود ہیں تم ان کو پا جاؤ گے۔‘‘ اگلے دن غزوہ ہوتا ہے۔ چاروں بیٹوں کی شہادت کی خبر پاتی ہیں تو سجدہ ریز ہو جاتی ہیں اور اللہ کا شکر بجالاتی ہیں کہ اُس نے میرے بیٹوں کو اپنے اعلیٰ مشن کے لیے قبول کر لیا۔

ہمارے اَسلاف کی مائیں دودھ پلاتے پلاتے جذبہ جہاد و دین سبق آموز واقعات کے ذریعے سے بچوں میں منتقل کر دیتی تھیں۔ لہٰذا اسلاف میں ہمیں جفاکش‘ بہادر‘ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے اور باطل نظام پر ہاتھ ڈالنے والے نوجوان نظر آتے ہیں! آج کی مائیں بھی بچوں کو دودھ پلاتی ہیں لیکن انہیں گہری نیند سلانے کے لیے‘ تاکہ وہ خود اپنی دُنیوی مصروفیات‘ فلموں‘ ڈراموں میں وقت ضائع کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں‘ اِلّا ماشاء اللہ! شاید اسی لیے پوری قوم سو رہی ہے۔

تعلقِ زوجین

زوجین کے تعلقات بھی ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي)) ''تم میں سے بہترین وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہترین ہیں اور ((اپنی مثال پیش کی)) مَیں تم میں سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بہترین ہوں۔'' (ترمذی)

ہم دوسروں کے لیے تو بہترین اور ملائم ہوں' ہمارا اندازِ گفتگو نرم ہو' رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ والی کیفیت ہو' لیکن جیسے ہی گھر کی دہلیز پار کر کے اندر داخل ہوں تو اخلاق وتہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ناک پہ آجائے اور کبھی ہاتھ بھی بے قابو ہو جائے۔ گھروں سے شکایتوں کی بازگشت شروع ہو جائے کہ آپ کے ساتھ تو آپ کے رفیق بڑے ملائم ہیں' بڑے مہذب ہیں مگر ہمارے ساتھ تو یہ منہ پھٹ اور ہاتھ جھاڑنے والے معاملات کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اس تعلق کے لیے لباس کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط﴾ (البقرۃ:۱۸۷) کیا ہم کبھی گندے ہاتھ اپنے لباس سے پونچھتے ہیں؟ تو پھر شوہر اور بیوی نے ایک دوسرے کو ٹشو پیپر زبنا کے کیوں رکھا ہوا ہے؟ میاں بیوی کے تعلق میں مزاج کی تلخی ملاحظہ فرمائیں کہ اگر قمیص کا بٹن ٹوٹ جائے تو فوراً لگا لیتے ہیں لیکن اگر دونوں میں سے کسی کا دل ٹوٹ جائے یا ناراضگی ہو جائے تو اسے انا کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے' ازدواجی تعلقات میں بدمزگی اور تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ زوجین کے مابین تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لیے اگر یہ حکمتِ عملی اپنا لی جائے کہ اگر ایک کسی بات پر خفا ہوگا تو دوسرا اسے منا لے گا اور اگر دوسرا روٹھ جائے تو پہلا منا لے گا' تو اس طرح تعلقات میں کبھی تناؤ پیدا نہیں ہوگا۔ خوبیوں پر نگاہ رکھ کر زندگی بسر ہو جاتی ہے' عیبوں پر نگاہ رکھ کر دو دن بھی جینا مشکل ہو جاتا ہے۔

گھر والوں کی تربیت سے حاصل ہونے والے فوائد

پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ جب ہم گھر والوں کی تربیت کریں گے تو اپنی بھی تربیت ہوگی۔ جو باتیں ہم چاہیں گے کہ اپنے بچوں میں دیکھیں وہ ہم اپنے اندر بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ دوسروں کو توجّہ دلائی جائے گی تو اپنی طرف انگلیاں اُٹھنے کا خوف بھی ہوگا۔

گھر والوں کی تربیت کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ فرائضِ دینی کی ادائیگی میں ہمارے لیے آسانی ہو جائے گی۔ پورا گھرانہ اگر ایک جیسے نظریات کا حامل ہو تو بہت آسانیاں ہو جاتی ہیں۔

ہمارے کردار کے متعلق گھر والوں کی طرف سے مثبت گواہی ہی بہترین گواہی ہے۔ آپ چھ سو کلومیٹر دور جا کے کسی شخص کو سینہ تان کر دعوت دیں تو وہ تو مرعوب ہوگا ہی' کیوں کہ وہ آپ کی اصلیت سے واقف نہیں ہوتا۔ گھر والے ہماری تمام عادات واطوار سے بخوبی واقف ہوتے ہیں' جب ہی تو گھر by pass ہوتا ہے۔ گھر والوں کو تبلیغ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی' ان سے نگاہیں چار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے گھر کی گواہی بہت وزن رکھتی ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں جب پوچھا گیا تو فرمایا: ''تم نے قرآن نہیں پڑھا؟'' صحابہ نے کہا: ہم قرآن تو پڑھتے ہیں' لیکن ہمارا سوال تو اخلاق کے بارے میں ہے۔ تو فرمایا: ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن'' ''آپ ﷺ کا اَخلاق قرآن ہی تو ہے۔'' (مسند احمد) تم قرآن پڑھو اور اس کی چلتی پھرتی تصویر اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی شکل میں عملی طور پر دیکھو! بہرحال' جب ہم تمام گھر والوں کی تربیت نظریاتی سطح پر کریں گے تو ہم سب ایک پیج پر ہوں گے اور دین کے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ قرآن مجید میں خوشخبری ہے کہ ایسا گھرانہ ان شاء اللہ جنّت میں بھی ساتھ ہوگا۔ سورۃ الطور میں ربِّ کائنات کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ط﴾ (آیت ۲۱)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی' ہم ان کی اولاد کو بھی ان (کے درجے) تک پہنچا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں بھی ایسا خوش نصیب گھرانا عطا فرمائے اور ہمارا گھر سکون ورحمت اور برکت کا مسکن بن جائے۔ آمین یاربّ العالمین!

میرے مولا مجھے اتنا تو معتبر کردے
مَیں جس مکان میں رہتا ہوں اسے گھر کر دے!

❁❁❁

عورت کا سماجی مقام

اسلام کی روشنی میں

ارسلان اللہ خان

قرآنِ مجید میں اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۶۰﴾ (الاحزاب)

’’اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! آپ اپنی بیویوں‘ اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی چادریں اپنے (چہرے کے) اوپر جھکا لیا کریں۔ اس طریقے میں اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی تو اُن کو ستایا نہیں جائے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

مندرجہ بالا قرآنی حکم کے ذیل میں علّامہ اقبال کے یہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں: ؎

ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است
کشادش در نمودِ رنگ و آب است
جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز
کہ اُو با صد تجلی در حجاب است!

’’عصرِ حاضر کا باطن بے نقاب ہو چکا ہے۔ اس کی رونق ظاہری چمک دمک کی نمائش میں ہے۔ (اے قوم کی بیٹی!) تُو نورِ حق سے جہاں کو منور کرنا سیکھ کہ وہ سو جلووں کے باوجود حجاب میں ہے۔‘‘

علّامہ اقبال مسلمان عورت کو فرماتے ہیں کہ اُسے پردے کے اہتمام کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیے کہ اُس کے نیک اثرات معاشرے پر مرتّب ہوں اور اُس کے پرتو سے حریم کائنات

اسی طرح روشن رہے جس طرح فاطر فطرت کی تجلی حجاب کے باوجود کائنات پر پڑ رہی ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دینِ اسلام کا خلاصہ پیش کیا تو مَردوں کو خاص طور پر وصیت فرمائی:

((أَلَا وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا)) (رواہ الترمذی)

’’آگاہ ہو جاؤ! عورتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو۔‘‘

قرآن وحدیث سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین کی عزّت اور احترام ان کی شرم وحیا میں ہے۔ حجاب اُن کی پہچان ہے۔ جب وہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکامات کے مطابق اپنی عزّت اور عفت کی حفاظت کریں گی تو ان شاء اللہ اُس عظمت کو پالیں گی کہ کسی کو اُن پر اُنگلی اُٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔

اسلام نے عورت کو بہت اونچا مقام ومرتبہ دیا ہے۔ امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے کسی طالبہ نے پوچھا: حضرت! یہ کیا کہ جتنے نبی تھے وہ سب مرد تھے؟ حضرت نے جواب دیا: ’’مرد رسول بنتے تھے‘ لیکن عورت رسول پیدا کرتی تھی۔‘‘

علّامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عورت اگر علم وادب میں مرد کے مقابلے میں کوئی بڑی خدمت انجام نہ دے سکے تب بھی صرف اس کی مامتا ہی نہایت قابل قدر ہے۔ اسی کے طفیل مشاہیر عالم پروان چڑھتے ہیں۔ دنیا کا ہر انسان اس احسان کے زیر بار ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں!
شَرف میں بڑھ کے ثریا سے مُشتِ خاک اس کی
کہ ہر شَرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں!

دینِ اسلام عورت اور مرد کی مساوات اور آزادئ نسواں کا سب سے بڑا عَلَم بَردار ہے۔ البتہ یہ مساوات اور آزادی اُس خلاقِ عالَم نے دی ہے جو ہر شے کی طرح اُس کا بھی خالق ہے۔ جس قدر خالق اپنی مخلوق کے بارے میں جانتا ہے مخلوق خود بھی اپنے بارے میں اس کے عُشرِ عشیر سے آگاہ نہیں۔ چنانچہ خواتین کو جو سماجی حقوق‘ مقام اور مرتبہ اسلام نے دیا ہے حقیقت میں وہی ان کے لیے سود مند ہے۔ مغرب نے خواتین کو آزادی کے نام پر جو کچھ دیا ہے وہ حقوق نہیں بلکہ ایک ایسا عذاب ہے جس نے مغربی معاشرے کی عائلی زندگی کو تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا ہے۔

مغرب نے عورت کو مَردوں کے مساوی حقوق دینے کے نام پر اسے گھر سے باہر لا کر کھڑا کر دیا اور یوں صنفِ نازک ہونے کی صفت چھین لی۔ بقولِ اقبال:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت!

ظہورِ اسلام سے قبل عرب جہالت اور گمراہی کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک عورت ایک باندی اور غلام کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس کی خرید و فروخت عام تھی۔ اُسے کسی بھی رشتے میں عزّت نہ دی جاتی تھی۔ بیٹی کی پیدائش پر ماتم اور سوگ کی سی کیفیت ہوتی اور بعض اوقات تو اُسے زندہ درگور کر دیا جاتا' جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ (التکویر)

''اور جب زندہ درگور کی گئی بچی سے پوچھا جائے گا' کہ اُسے کس جُرم میں قتل کیا گیا!''

کسی صالح اور عادل معاشرے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ عورت کی شخصی حیثیت کا تعین کرے۔ قرآن حکیم میں عورت کا مقام و مرتبہ کئی مقامات پر بیان ہوا ہے۔ بالخصوص سورۃ النساء میں اُس کی حیثیت بطور ماں' بہن اور بہو تک بیان فرما دی گئی ہے۔ سورۃ الاحقاف میں عورت کی بطور ماں فضیلت بیان کی گئی ہے کہ وہ کس طرح اپنی جان مشقّت میں ڈال کر اولاد کو پیدا کرتی' پالتی اور معاشرے میں جینے کے قابل بناتی ہے۔ بیٹی کو والدین کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے۔ ترمذی کی حدیث ہے: ''بیٹی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پردہ ہے۔''

اسلام ایک نہایت متوازن' معتدل اور قابلِ عمل دین ہے۔ بہت سے لوگ حقوق اور آزادی کے نام پر عورت کو اسلام کی تعلیمات کے بارے میں گمراہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ اپنی جاہلانہ قبائلی رسوم کو اسلام سے جوڑ کر خواتین کے جائز حقوق پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ کہیں خواتین کی تعلیم پر پابندی عائد کی جاتی ہے تو کوئی شادی کے بعد اُن کو اپنے والدین سے ملنے نہیں دے رہا۔ اسلام میں انتہا پسندی قطعاً نہیں ہے۔ یہ لوگوں کے خود ساختہ رسوم و رواج ہیں جن کو انہوں نے اسلام کا نام دے رکھا ہے۔

مرد اور عورت تمدن کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اُن کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی کیفیات مختلف ہیں اور یہ اختلافات ان کے خالق نے تمدن کی ضرورت کے تحت رکھے ہیں۔ انسان

ہونے کے ناتے سے وہ ایک دوسرے کی جنس ہیں' لیکن دینی اور اخلاقی اعتبارات سے دونوں کا جداگانہ اور مستقل تشخّص ہے اور وہ اپنی اپنی شخصیت کے ذمہ دار ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝۳۵﴾ (الاحزاب)

''بالیقین جو مرد اور عورتیں مسلم ہیں' ایمان والے ہیں' مطیع فرمان ہیں' راست گو و راست باز ہیں' صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں ہیں' روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں ہیں' عصمت مآب ہیں' اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں ہیں' اللہ نے ان (مَردوں اور عورتوں) کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔''

غور کیجیے کہ دینی و اخلاقی مساوات کو یہاں کس قدر حسین اور جامع اسلوب سے نمایاں کیا گیا ہے۔ جتنے اعلیٰ اوصاف کا حامل ایک مسلمان مرد ہو سکتا ہے اُتنے ہی اعلیٰ اوصاف سے ایک مسلمان خاتون بھی متصف ہو سکتی ہے۔

تاریخِ انسانی میں اسلام ہی نے پہلی بار عورت کو مستقل قانونی تشخص (legal status) عطا کیا۔ اسلام میں عورت کو نہ صرف حقِ ملکیت حاصل ہے بلکہ وہ اُس پر تصرف کا اختیار بھی رکھتی ہے۔ دُنیا کے کسی مذہب نے عورت کو یہ حق فراہم نہیں کیا۔ دیگر مذاہب میں عورت کو سراپا شر ہی شر بلکہ بُرائی اور بدی کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ انگریزی میں شیطان' بُرائی اور بدی کے لیے لفظ Evil بولا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ Eve سے بنا ہے جو (معاذ اللہ!) اماں حوّا (سلامٌ علیہا) کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے عورت کو روحانی' اَخلاقی اور قانونی تشخّص عطا کیا۔ دُنیا نے عورت کو پستی دی جبکہ اسلام نے اُسے پستی سے اُٹھا کر اعلیٰ وارفع مقام پر فائز کیا۔

اسلام نے نکاح میں لڑکی کی رضامندی کا پورا خیال رکھا ہے۔ کوئی کسی لڑکی سے زبردستی نکاح نہیں کر سکتا۔ اسلام سے قبل عورتیں مَردوں کی ملکیت تصوّر کی جاتی تھیں۔ اُنھیں اپنی مرضی سے نکاح کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اگر کسی عورت کو طلاق ہو جاتی یا وہ بیوہ ہو جاتی تب بھی وہ

اپنی مرضی سے دوبارہ شادی نہیں کرسکتی تھی۔ اسلام نے عورت کو مہر کا حق ودیعت کیا۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ملکیت کی صورت میں رائج نہ تھا۔ اسلام نے اس حوالے سے عورت کو بہترین تحفظ فراہم کیا کہ مہر کو لڑکی کی ملکیت بنایا تاکہ وہ اسے اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ کے استعمال کرسکے۔

اسی طرح اسلام نے عورت کو حق خلع بھی دیا ہے۔ اگر عورت اپنے شوہر سے نالاں ہو اور اُس کے ساتھ کسی صورت نہ رہنا چاہتی ہو تو اُسے پورا حق ہے کہ وہ قاضی کے ذریعے خلع لے کر اپنے شوہر سے علیحدہ ہوسکتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ کوئی معمولی حق نہیں ہے۔ اس حق کے استعمال سے بہت سی خواتین ایسے شوہروں سے جان چھڑانے میں کامیاب ہوگئیں جو اُن پر ظلم کرتے تھے یا نشہ کرتے تھے یا دوسرے غیر اخلاقی کاموں میں ملوث تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ خواتین سے کیسا برتاؤ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ جب حضرت حلیمہ سعدیہ ؓ کو دیکھتے تو اپنی چادر بچھا دیتے، اُنھیں اپنی ماں کہہ کر پکارتے۔ اپنی دودھ شریک بہن حضرت شیما ؓ کا بے حد احترام فرماتے۔ آپ ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ نہایت احترام، محبت اور مودّت کا معاملہ فرماتے۔ نہ کبھی ڈانٹتے، نہ جھڑکتے۔ اپنی دُختر حضرت فاطمۃ الزہراء ؓ سے اس قدر شفقت فرماتے کہ اُن کو دیکھ کر کھڑے ہوجاتے۔ جس نبی ﷺ کا خواتین سے یہ معاملہ ہو، اُس کے لائے ہوئے دین سے زیادہ خواتین کا احترام کسی اور دین میں ہو ہی نہیں سکتا۔

اسلام نے مرد کو عورت کا محافظ بنایا ہے۔ جب وہ بیٹی ہے تو باپ محافظ، بہن ہے تو بھائی محافظ، بیوی ہے تو شوہر محافظ، اور ماں ہے تو بیٹا محافظ۔ عورت کے نان نفقہ اور رہائش کا حسب استطاعت انتظام مرد کے ذمے ڈالا گیا۔ گویا کسبِ معاش کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانے کو اسلام نے نسوانیت کی توہین قرار دیا ہے۔ وہ اقلیمِ خانہ و دل کی تاجدار (گھر اور دل کی بادشاہت کی ملکہ) ہے، اُس کے نازک کندھوں پر روزی اور کسبِ معاش کی تگ و دو کا بار ڈالنا نسوانیت کی توہین ہے۔ البتہ اگر کوئی مجبوری ہو تو یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسی خواتین جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے اُن کے وظائف مقرر کرے۔

آج کبھی عورت مارچ کے نام پر تو کبھی حقوقِ نسواں اور آزادیٔ نسواں کا ڈھنڈورا پیٹ کر مسلمان خواتین کو گمراہ کرنے کی عالمی سازش ہو رہی ہے۔ معدودے چند حیا باختہ خواتین بیہودہ

قسم کے بینرز اُٹھائے مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں لیکن اُن کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے جیسے پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہو۔ دوسری جانب، الحمد للہ، پاکستان کی مذہبی ہی نہیں جدید تعلیم یافتہ خواتین بھی اس قسم کے واہیات نعروں اور مظاہروں کو مسترد کرچکی ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ منفی پروپیگنڈا پھر بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ ایسے میں بحیثیت مسلمان اور پاکستانی ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے قلم کی تلوار لے کر اُٹھ کھڑے ہوں، کیونکہ مغرب کی اندھا دھند تقلید میں خواتین کے حقوق کے نام پر بے حیائی کو عام کیا جارہا ہے جبکہ کچھ نادان خواتین اس زہر کو اَمرت سمجھ رہی ہیں۔ بقول حسرت موہانیؒ ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے!

اسلام نے علم کا حصول مرد اور عورت دونوں پر لازم قرار دیا۔ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمانِ ذی شان ہے:

((طَلَبُ العِلمِ فریضةٌ علی کُلِّ مُسلم)) (ابنِ ماجه)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے۔''

پیارے آقا ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدّیقہ ؓ خود اُمّت کی سب سے پہلی فقیہہ تھیں۔ آپ ؓ نے خواتین کے حوالے سے جتنے مسائل تھے وہ سب بیان فرمادیے۔ آپؓ سے بے شمار احادیث مروی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں خاتون کا اتنا بلند مقام ہے کہ خود زوجۂ رسول ﷺ بہت بڑی عالمہ تھیں اور یہ علم انہوں نے اپنے سرتاج، سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے حاصل کیا تھا۔ خود کو جدید سمجھنے والے موجودہ زمانے میں بھی ایسی مثال ملنا محال ہے۔

علّامہ اقبال قوموں کی تاریخ اور اُن کے ماضی و حال کو اُن کی ماؤں کی پیشانیوں کا فیض قرار دیتے ہیں کہ ماؤں کی پیشانیوں پر جو لکھا ہوتا ہے وہی قوم کی تقدیر ہوتی ہے۔

خنک آں ملتے کز واردا تش
قیامت ہا بہ ببیند کائنا تش

چہ پیش آید چہ پیش اُفتاد اُو را
تواں دید از جبینِ اُمہاتش!

’’مبارک ہے وہ ملّت جس کے کارناموں کے سبب‘ کائنات نے کئی قیامتیں دیکھیں۔ کیا پیش آنے والا ہے‘ کیا پیش آ چکا ہے‘ (یہ سب کچھ) ماؤں کی جبینوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔‘‘

اسلام نے عورت کو جو سماجی مقام و مرتبہ عطا کیا ہے اگر اُس کا خلاصہ بیان کیا جائے تو جوامع الکلام رسولِ محترم ﷺ کا یہ فرمان کافی نظر آتا ہے جو آپ ﷺ نے ایک صحابی کو تلقین فرمایا تھا۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس ایک غزوہ میں شرکت کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: کیا تمہاری ماں موجود ہے؟ جواب اثبات میں پا کر آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَالْزَمْهَا‘ فَإِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا)) (رواه النسائی وابن ماجه)

’’پس اُس کی خدمت میں لگے رہو‘ کیونکہ جنّت اُس کے قدموں کے نیچے ہے۔‘‘

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ:14) ’’اور نماز قائم کرو میری یاد کے لیے!‘‘

فلسفۂ دین کی رُو سے
طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے

نماز کی خصوصی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے دو (2) فکر انگیز اور بصیرت افروز خطابات

o امپورٹڈ بک پیپر o عمدہ طباعت o خوبصورت ٹائٹل
o صفحات:56 o قیمت:60 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور، 36 کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور، 3-35869501-042

اسرائیلی تعلیمی نصاب کی ایک جھلک

رضی الدین سیّد

نئے عالمی نظام اور امریکی ایجنڈے کے تحت پورے عالمِ اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً دوسری بڑی منفی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اسکولوں‘ کالجوں اور جامعات کے تعلیمی نصابوں کو تبدیل کرنے اور انہیں لبرل بنانے کا کام بھی زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ تمام انسان برابر ہیں‘ لہٰذا بنیاد پرستی پھیلانے اور دوسرے مذاہب کے خلاف تعصّبات کو جنم دینے والے مضامین کو درسی کتابوں سے نکال دینا چاہیے۔ یاد رہے کہ معروف فری میسنری تنظیم کا نعرہ بھی یہی ہے: ’’مذہبِ انسانیت ہی فی الاصل مذہبِ محبّت ہے۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں ہمارے قومی نصاب سے سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ اور حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مضامین اور بعض حمدیہ نظمیں اور نعتیں بھی خارج از نصاب کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دَور میں یہودیوں کے خلاف ہونے والی جنگِ خیبر اور بھارت کی جانب سے مسلّط کردہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کو بھی درسی کتابوں سے خارج کیا جا چکا ہے۔ ان معاملات پر پورے پاکستان میں بڑا واویلا مچا تھا اور ایک ہمہ گیر تحریک بھی چلی تھی‘ لیکن جن صہیونی منصوبوں کو دنیا بھر میں نافذ العمل ہونا ہوتا ہے‘ ان کے خلاف کسی بھی قسم کا احتجاج ہمارے ہاں بے معنی سمجھا جاتا ہے۔

ایک طرف ہمارے حکمرانوں کی ذہنی مرعوبیت کا درجِ بالا نمونہ ہے اور دوسری طرف خود صہیونیوں کا اپنا طرزِ عمل ہے جو ہر معاملے میں یکسو ہیں اور جنہیں اپنے ہاں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں ہے۔ یہاں ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ خود اسرائیل میں تعلیمی اداروں میں نصاب کی کیا حالت ہے‘ اور وہاں طلبہ کو کیا پڑھایا اور سکھایا جا رہا ہے!

امریکہ میں مقیم ایک عرب عیسائی اسٹیون سیلیٹا (Steven Saliata) نے اپنی کتاب

ای میل: national.a.research@gmail.com

Anti-Arab Racism in The USA میں اسرائیلی تعلیمی نصاب کے بارے میں کافی کچھ تفصیل سے بتایا ہے۔ تل ابیب یونیورسٹی نے اپنے طلبہ کے لیے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ’’یہودی ایک منصفانہ انسانی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہیں‘‘۔ اسرائیلی کتابوں میں یہودیوں کو بہادر‘ محنت کش اور ملک کی ترقی میں مددگار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے‘ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ عرب ان تمام خصوصیات سے عاری ہیں۔ ان کتابوں میں عربوں کو ایک ایسی قوم ظاہر کیا گیا ہے جو کمتر‘ غیر مہذّب‘ سست الوجود اور بے حس ہے۔ ان کے مطابق عرب قاتل ہیں‘ وہ جلاؤ گھیراؤ کرتے ہیں اور آسانی سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ یہ منتقم مزاج‘ ذہنی طور پر بیمار اور ہنگامہ آرائی کرنے والے لوگ ہیں۔

اگرچہ اسرائیلی نصابوں میں حالات کے تحت بعض اصلاحات بھی کی جا رہی ہیں لیکن ان کا تعلق فلسطین اور اس کے باشندوں کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک سترہ سالہ اسرائیلی طالب علم نے بتایا کہ اس کی کتابیں اسے بتاتی ہیں کہ ہر وہ کام جو یہودی کرتے ہیں‘ عمدہ اور قانونی ہوتے ہیں جبکہ عربوں کے تمام فیصلے غلطی سے پُر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ عرب ان یہودیوں کو فلسطین سے نکالنے کے ہمیشہ درپے رہتے ہیں۔ تعلیمی کتابوں میں اس طرح کے اسباق سمو کر وہاں کی حکومت ابتدا ہی سے یہودی طلبہ میں عربوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے بیج بونے کی کوشش کرتی ہے۔

حیفہ کے ایک اسکول کی چھٹی جماعت کے ستّر فیصد یہودی طلبہ نے بتایا کہ عرب باشندے قاتل‘ اغوا کنندہ‘ جرائم پیشہ اور دہشت گرد ہوتے ہیں۔ اسی اسکول کے اسّی فیصد طلبہ نے بتایا کہ عرب لوگ گندے ہیں اور ان کے چہرے دہشت ناک ہیں۔ نوے فیصد طلبہ نے اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل پر فلسطینی عربوں کا کوئی حق نہیں ہے۔

۱۹۶۷ء سے اب تک جو کتابیں اسرائیل میں شائع ہوتی چلی آ رہی ہیں‘ ایک امریکی مصنف و ایڈیٹر ’’کوہن‘‘ کے مطابق ان میں سے ۵۲۰ کتابوں میں فلسطینیوں کے بارے میں توہین آمیز اور منفی تبصرے پائے جاتے ہیں۔ عربوں کو تشدد پسند‘ برائی کا سرچشمہ‘ جھوٹے‘ لالچی‘ منافق اور غدار قرار دیا گیا ہے۔ رسوا کرنے کی خاطر عربوں کے لیے یہ الفاظ بھی بار بار استعمال کیے گئے ہیں: قاتل: ۲۱ بار‘ سانپ: ۶ بار‘ منحوس جانور: ۱۷ بار‘ خون کے پیاسے: ۲۱ بار‘ بھوتوں اور جنوں پر یقین رکھنے والے: ۹ بار‘ اونٹ کے کوہان: ۲ بار۔

عربوں کے بارے میں یہ خرافات عبرانی ادب و تاریخ کا ایک بڑا حصّہ ہیں۔ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے ابتدا ہی سے دشمنی بھرا رویّہ رکھتے ہیں' تاکہ یہودی طلبہ عربوں کے ساتھ ''معاملہ'' کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسرائیلی مصنّفین خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

سابق اسرائیلی صدر موشے کٹساؤ (Katsav) نے کہا تھا کہ ہمارے اور دشمنوں کے درمیان ایک بڑا خلا ہے۔ یہ خلا محض صلاحیتوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ اخلاق' تمدن' انسانی جانوں کی حرمت اور ضمیر کے لحاظ سے بھی ہے۔ فلسطینی وہ لوگ ہیں جو ہمارے براعظم اور ہماری دنیا سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔ ان کا تعلق ایک دوسری کہکشاں سے ہے۔

اسرائیلی تعلیمی اداروں کے مختلف درجات میں یہودیوں پر ہٹلر کے مظالم کا مبالغہ آمیز قصّہ ''ہولوکاسٹ'' کے نام سے پڑھایا جانا بھی لازمی ہے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے باپ دادا کی قربانیوں اور یہودی قوم کے دنیا بھر میں مظلوم ہونے کی حالت سے واقف ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ ظلم و ستم کے تفصیلی اور بار بار کے مطالعے سے ان کے اندر انتقام کا شدید ردِّعمل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہودی شریعت کے مطابق دنیا بھر میں پائے جانے والے تمام غیر یہودی بشمول عیسائی اور مسلمان ''گوئم'' اور ''انسان نما حیوان'' (Gentiles) ہیں۔ لہٰذا اسی بنیاد پر ان کی ہر سطح کی درسی کتابوں میں یہودی طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ باقی تمام قوموں کو گوئم' رذیل' اور چوپائے سمجھیں۔ افسوس کہ آج کوئی اسرائیل سے یہ نہیں کہتا کہ وہ بھی اپنے نصاب سے انتقامی ردّعمل کو جنم دینے والے ہولوکاسٹ اور گوئم والے اسباق خارج کر دے۔

یہودی مصنّفین اسرائیل شہاک اور نورٹن میزنسکی اپنی کتاب Jewish Fundamentalism in Israel (''اسرائیل میں بنیاد پرستی'' ترجمہ: محمد احسن بٹ) میں لکھتے ہیں کہ اسرائیل کے تعلیمی اداروں میں طلبہ کو یہودیوں کی بنیادی مذہبی کتاب ''تالمود'' کا مطالعہ ضرور کروایا جاتا ہے۔ طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ عبادت کرنے' خیرات دینے' یا دوسرے نیک کام کرنے کی بجائے تالمود کا مطالعہ ان کے لیے جنّت میں داخلے کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ مزید یہ کہ جو طلبہ تالمود کے مطالعے میں منہمک ہوتے ہیں وہ خود اپنے' اپنے خاندان' اپنے مالی معاونین اور کسی حد تک دوسرے یہودیوں کے لیے بھی جنت میں داخلے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

یہی مصنّفین لکھتے ہیں کہ ریاست اسرائیل کے قیام کے چند سالوں بعد ہی اسکولوں کی ریاضی کی کتابوں سے جمع کا نشان + ختم کر کے اس کی جگہ الٹے T کا نشان یہ کہتے ہوئے لگایا گیا تھا کہ جمع کا نشان یہودی بچوں کو مذہبی اعتبار سے بگاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ یہی نشان وہاں آج تک جاری ہے۔ اسی ایک مثال سے یہود کی بنیاد پرستی کی شدّت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہودی مذہب پر معروف رِبیوں (ابراہام جے وِٹی اور راشیل جے وٹی) کی لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب ''ایکسپلورنگ جوئیش ٹریڈیشن'' میں بتایا گیا ہے کہ ''یہودی اساتذہ اپنے طلبہ کو یہ ذہن نشین کرواتے ہیں کہ جیسے جیسے وہ بوڑھے ہوتے جائیں گے' انہیں اندازہ ہوگا کہ تورات کے ہر حرف کے پیچھے کتنے آنسو اور مشکلات پوشیدہ ہیں''۔ اس طرح کی ایک نظم کا نمونہ یہ ہے:

''پڑھو الف بے۔ جو مَیں کہہ رہا ہوں' بچو! اسے دھیان سے سنو! جب تم بڑے
ہو جاؤ گے تو خود سمجھ جاؤ گے کہ ہر حرف کے اندر کتنے آنسو اور کتنے بین پوشیدہ ہیں!''

ان الفاظ سے شاعر دراصل طلبہ کو یہ سمجھانا چاہ رہا ہے کہ موجودہ تورات کو تم تک پہنچانے میں ہمارے آباء و اجداد کو کس قدر دکھوں اور اذیتوں سے گزرنا پڑا ہے۔

اس وقت امریکہ اور اسرائیل میں اَن گنت اسکول اور کالج ایسے ہیں جن میں مرد و خواتین کو تورات اور جدید علوم' دونوں کا عالم بنائے جانے کے کورس کروائے جاتے ہیں۔ ایک بڑا ربی الزر' ایسی تعلیم کے بارے میں یہ اصول طے کرتا ہے کہ: ''اگر تورات نہیں تو دنیا کا کوئی پیشہ نہیں۔ اگر آٹا نہیں ہے تو تورات نہیں' اور اگر تورات نہیں تو آٹا بھی نہیں''۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تمام کاروباروں اور پیشوں کو صرف خدا کی ہدایت کے مطابق ہی چلانا چاہیے جس کے لیے تورات کے گہرے علم کی ضرورت ہے۔ اس طرح یہودی رِبی طلبہ کو مذہبی بنیاد پرستی اپنے ذہنوں میں مستحکم کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

تورات کی تشریح کرتے ہوئے یہودی قوانین کی کتاب ''تالمود'' نے انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا ایک نظام الاوقات پہلے ہی سے طے کر دیا ہے۔ تالمود کہتی ہے:

''پانچ سال کی عمر سے بائبل (تورات اور زبور) کو پڑھنا شروع کرو۔ تیرہ سال کی عمر میں مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ پندرہ سال کی عمر سے تالمود کا مطالعہ کرنے لگو۔ بیس سال کی عمر سے رزق کی تلاش کرنے نکل کھڑے ہو''۔ (کتاب

''تالمود بے نقاب ہوتی ہے'' ترجمہ راقم' باب 5 Avot 21:)

یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس طرح کا نصاب پڑھائے جانے سے یہودی طلبہ کے اندر سوائے اس بنیاد پرستی کے' جسے اسلامی ممالک کے نصاب سے خارج کرنے کے لیے صہیونی اورامریکی مل کر احکام جاری کررہے ہیں' دوسری اور کیا صفت پیدا ہوگی! عالمی طور پر نصاب میں تبدیلی کی جو مہم صہیونیوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے شروع کی تھی' اسے سب سے پہلے ایک امریکی صنعتکار اور فورڈ کار کے بانی ہنری فورڈ اول نے محسوس کیا تھا۔ اپنی کتاب ''دی انٹرنیشنل جیو'' (اردو ترجمہ ''عالمی یہودی فتنہ گر'' از میاں عبدالرشید' صفہ پبلشرز لاہور) میں اس نے تفصیل سے لکھا ہے کہ:

''ہماری اولادوں کو ان کے آباء واجداد کے ورثے سے محروم کیا جارہا ہے۔ جوانی کے ابتدائی ایام میں جب کہ لڑکے آزادیٔ فکر سے نئے نئے روشناس ہوتے ہیں' یہودی انہیں اپنے نرغے میں لے کر ان کے ذہنوں میں ایسے خیالات ٹھونس دیتے ہیں جن کے خطرناک نتائج کو ہماری اولاد اس وقت محسوس نہیں کرسکتی.....

پروفیسروں اور طلبہ کو ساتھ ملا کر یہودی اپنے کام کو معزز بنالیتے ہیں۔ یہ لوگ آرٹ' سائنس' مذہب' معاشیات' اور سماجیات غرضیکہ ہر مضمون میں اپنے نظریات داخل کردیتے ہیں۔ یہ یہودی طریقۂ کار اب پوری طرح ظاہر ہوچکا ہے۔ یعنی پہلے طلبہ کو سیکولر بناؤ۔ دوسرے الفاظ میں بچے کو یہ تعلیم نہ دو کہ اس کی تہذیب وتمدن کا تعلق ایک قدیم مذہب کے گہرے اصولوں سے ہے۔ یہی ہے وہ لبرل ازم' یہودی جس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں!'' (باب: یہودی اثرات کے مختلف پہلو)

عالمی طور پر نصاب میں تبدیلی کی یہ بات ہمارے سامنے اور زیادہ واضح ہوکر تب سامنے آتی ہے جب ہم صہیونیوں کے بڑوں کی مرتب کردہ قدیم دستاویز ''پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زائینس'' کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے عیسائی اور مسلم تعلیمی اداروں کے بارے میں اپنے نظریات کو صاف طور پر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''جب ہماری حکومت قائم ہوگی تو سب سے پہلے ہم یونیورسٹیوں کی تعلیم کی ازسرِنو تنظیم کریں گے۔ اس مقصد کے لیے ایک خفیہ پروگرام کے تحت یونیورسٹیوں کے

افسروں اور پروفیسروں کو نئے سرے سے تیار کیا جائے گا۔ نصابِ تعلیم سے ایسے تمام مضامین خارج کردیے جائیں گے جو ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ غیر یہودی عوام کو ایک ایسا فرماں بردار وحشی جانور بنادیا جائے جو خود سوچنے سمجھنے سے عاری ہو۔'' (دستاویز ۱۶)

یہی وہ رہنما خطوط ہیں جن کی بنیاد پر صہیونیوں نے پہلے تو عیسائی تعلیمی اداروں پر شب خون مارا' کیونکہ تب وہ ان کے بدترین دشمن تھے' اور اب وہ مسلم تعلیمی اداروں پر حملہ کررہے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ سب کچھ عیاں ہونے اور اس کے خلاف پُرزور احتجاج کے باوجود عقل وخرد سے عاری ہمارے حکمران تعلیمی نصاب میں مسلسل منفی تبدیلیاں کیے جارہے ہیں۔

ہنری فورڈ سوال کرتا ہے کہ اب اس کا علاج کیا ہوسکتا ہے! پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ:

''علاج بالکل آسان ہے۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ تمام افکار کی پشت پر وہ یہودی ہیں جو ہمیں اپنے ماضی سے کاٹ کر مستقبل کے لیے مفلوج کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بتایا جائے کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو یورپ سے تہذیب وتمدن لے کر آئے ہیں۔ اب یہ یہودی ہمارے اندر آ گھسے ہیں جن کی کوئی تہذیب ہے نہ مذہب۔ نہ انہوں نے ماضی میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں ان کے عزائم اعلیٰ ہیں۔'' (ص: ۱۴)

ایک اور مغربی مصنف ولیم گائی کار اپنی معروف تصنیف Pawns in the Game میں لکھتا ہے کہ ''ان کی قوت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے گماشتے اپنی صلاحیتوں کے باعث ہمارے تعلیمی اداروں میں ایسے واقعات بھی پڑھانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو کبھی رونما ہی نہیں ہوئے۔''

شہاب نامہ

اس ضمن میں ایک اور چشم کشا حقیقت معروف سابق بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کے ''شہاب نامہ'' میں پیش کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فلسطینی مہاجرین کے بچوں کے لیے یونیسکو نے اپنے خرچ پر یروشلم' دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں بہت سے اسکول کھول رکھے تھے۔ ان اسکولوں

میں تربیت یافتہ مسلمان اساتذہ بھی یونیسکو کی منظوری سے تعینات ہوتے تھے اور ان میں جو درسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ بھی یونیسکو کی جانب سے منظور شدہ ہوتی تھیں۔ جب یروشلم سمیت ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کرلیا تو رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اسرائیلی حکومت نے ان اسکولوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یونیسکو کے متعین کردہ مسلمان اساتذہ کو زبردستی گھر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو باقاعدہ ملتی ہے لیکن کسی اسکول کے قریب تک آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی استاد کسی جگہ حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے تو وہ اپنے بال بچوں سمیت ناقابلِ بیان مظالم اور تشدد کی زد میں آجاتا ہے۔ ان مسلمان اساتذہ کی جگہ ہر اسکول میں اب کٹر یہودی اسٹاف فلسطینی مہاجر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہے۔ اس کے علاوہ ہر اسکول سے یونیسکو کی منظور شدہ درسی کتابیں بھی نصاب سے خارج کردی گئی ہیں اور ان کی جگہ اب ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں اسلام، سیرت مبارکہ اور عرب تاریخ وثقافت کے خلاف انتہائی گمراہ کن، غلیظ اور شرمناک پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ہر اجلاس میں عرب ممالک کے نمائندے اسرائیل کی ان مذموم حرکات کا کچا چٹھا کھولتے تھے اور اپنے ثبوت میں ان کتابوں کے نمونے بھی پیش کرتے تھے جو اس نے یونیسکو کے قائم کردہ اسکولوں میں زبردستی رائج کی ہوئی تھیں۔ صحیح حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے دوبار ایک معائنہ ٹیم اسرائیل گئی لیکن دونوں بار ہمیں یہ رپورٹ ملی کہ عربوں کے الزامات کی تصدیق میں مقامی طور پر کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ ٹیمیں اسرائیلی حکومت کے ساتھ پہلے سے اپنا پروگرام طے کرکے وہاں جاتی تھیں اور معائنہ کے روز اسرائیلی حکام متعلقہ اسکولوں میں یونیسکو کے منظور شدہ اساتذہ اور کتابوں کی نمائش کا ڈرامہ رچا دیتے تھے!

ایگزیکٹو بورڈ میں عرب نمائندوں کے ساتھ میرے بڑے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ ہم لوگ آپس میں مل جل کر اکثر ایسی تدبیریں سوچا کرتے تھے جن سے اسرائیل کی اس صریح دھاندلی اور اسلام دشمنی کا بھانڈا پھوڑا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سب کی یہی متفقہ رائے ہوئی کہ کسی قابلِ اعتماد شخص کو خفیہ مشن پر اسرائیل بھیجا جائے اور وہ وہاں سے اسرائیل کے خلاف عائد کردہ الزامات کا ایسا ثبوت فراہم کرے جو ناقابلِ تردید ہو۔ کئی ہفتوں کی چھان بین اور بحث مباحثہ کے بعد انجام کار قرعۂ فال میرے نام

نکلا۔ مَیں نے بھی اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرلیا۔ میرے دل میں ایک لگن یہ بھی تھی کہ شاید اسی بہانے میرے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی بچوں کی کوئی خدمت ہوجائے جو اسرائیل کے قبضۂ اختیار میں آکر ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے جن میں دینِ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر انتہائی رکیک، بے بنیاد اور گمراہ کن حملے کیے گئے تھے۔ چنانچہ میرا رابطہ ایک خفیہ تنظیم سے قائم ہوگیا۔ چند ہفتے مجھے پیرس، قاہرہ اور بیروت میں زیرِ تربیت رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک جعلی ایرانی پاسپورٹ پر مجھے دس روز کے لیے اسرائیل بھیجنے کا پروگرام طے ہوگیا۔ اس زمانے میں سابق شاہِ ایران کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا تھا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر کسٹم والوں سے فارغ ہوکر جب مَیں اپنا سامان لیے باہر نکلا تو اسرائیلی ٹورسٹ کارپوریشن کے ایک خوش لباس نوجوان نے لپک کر مجھے خوش آمدید کہا۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دبی زبان سے وہ شناختی الفاظ بھی ادا کیے جن کے متعلق مجھے پیرس میں آگاہ کردیا گیا تھا۔ جواباً مَیں نے بھی اپنے مقررکردہ شناختی الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ''مصطفیٰ'' نے اگلے دس روز کے لیے میرا مکمل چارج سنبھال لیا۔

مصطفیٰ اس نوجوان کا کوڈ نام تھا۔ چھبیس ستائیس برس کا یہ پڑھا لکھا فلسطینی جوان کئی سال سے جان کی بازی لگا کر اسرائیل میں آزادیٔ وطن کی خاطر طرح طرح کے خفیہ فرائض انجام دے رہا تھا۔ اسی کے زیرِ اہتمام مَیں یونیسکو کے قائم کردہ بہت سے اسکولوں میں گیا اور ۱۱۳ شرانگیز کتابوں کے نسخے حاصل کیے جو اسرائیلیوں نے یونیسکو کے منظور شدہ نصاب کی جگہ وہاں پر زبردستی رائج کر رکھے تھے۔ ان کتابوں پر مَیں نے ہیڈ ماسٹروں اور دیگر کئی اساتذہ کے آٹوگراف بھی لیے۔ یہ وہ یہودی ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ تھے جنہیں یونیسکو کو دھوکا دے کر مسلمان اساتذہ کی جگہ تعینات کیا گیا تھا۔ کئی جگہ مَیں نے ان کی بہت سی خفیہ تصویریں بھی اتاریں۔ ایک دو اسکولوں میں وہاں کے یہودی اسٹاف کے ساتھ میرا گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا۔ ایک اسکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نہایت کڑی اور ذلّت آمیز سزا مل رہی تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے اپنی کتاب کا وہ حصّہ پڑھنے سے انکار کردیا تھا جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں انتہائی گستاخ الفاظ درج تھے۔ ہم نے اپنے خفیہ کیمرے کی مدد سے اس

سین کی پوری فلم اتار لی جس کی لمبائی دو سو فٹ سے بھی کچھ اوپر تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ پیرس واپس آنے کے بعد اسرائیل سے لائی ہوئی میری شہادتوں کو یونیسکو والوں نے تسلیم کرلیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے ایسے اقدامات کیے کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے قائم کردہ تمام اسکولوں میں عربوں کا منظور شدہ درسی نصاب ازسرِنو رائج ہوگیا اور اسرائیل کی لگائی ہوئی ۱۱۳ شرانگیز کتابیں بھی منسوخ ہوگئیں۔ اس کے علاوہ آئندہ اس صورتِ حال پر کڑی نظر رکھنے کے لیے قابلِ اطمینان بندوبست بھی کردیا گیا۔'' (یونیسکو)

کاش کہ ہمارے مسلم حکمران سمجھ سکیں کہ جن صہیونیوں کے ایما پر وہ اپنے ہاں کے قدیم تعلیمی نصابوں کی مسلسل ادھیڑبُن میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے خود اپنے ملک میں دوسروں کے خلاف نفرت، نسلی برتری، بنیاد پرستی اور دوسروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کو اپنی نصابی کتابوں کے ہر ہر صفحے پر بکھیرا ہوا ہے۔ عالمی امن کی خاطر اگر کسی اسلامی ملک کا تعلیمی نصاب تبدیل ہونا ناگزیر ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ پھر ریاست اسرائیل کے تعلیمی نصاب کو بھی ازسرِنو ترتیب دیا جانا چاہیے۔ جس وقت عیسائی دنیا یہودیوں کو بری طرح مار رہی تھی اور وہ پناہ کی تلاش میں ساری دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے، اُس وقت مسلم اسپین میں یہودیوں کو خوش آمدید کہا جارہا تھا اور پُرسکون زندگی گزارنے کی سہولت دی جارہی تھی۔ یہی وہ مسلم ہسپانیہ تھا جہاں پہنچ کر یہودیوں نے اپنی علمی و تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار بخشا تھا۔ اس بات کا اعتراف خود یہودی مفکّرین آج بھی کرتے ہیں۔ امریکی رِبّی Benjamin Blech نے اپنی کتاب Jewish History and Culture میں دل سے اعتراف کیا ہے کہ باقی عیسائی یورپ کو چھوڑ کر کریسنٹ اور اسٹار نے اس خطرناک دور میں جو سلوک ہمارے ساتھ کیا تھا، وہ اتنا شاندار تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ ہمارے مسلم حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ یہودیوں کو یہ احساس دلائیں کہ اسرائیلی تعلیمی نصاب میں ہمارے اس احسان کا بھی ذکر کیا جائے۔ یوں اسرائیلی طلبہ کو بھی اندازہ ہوسکے کہ جب یہودی ہر طرف سے عیسائیوں کے ہاتھوں کھدیڑے جارہے تھے، اس وقت یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے انہیں امن اور تحفّظ فراہم کیا تھا!

❁❁❁

مہمان زحمت نہیں، رحمت ہے!

حافظ محمد اسد*

موجودہ نظامِ تمدن میں گو مہمان نوازی کی ذمہ داری ہوٹلوں اور ریستورانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گزشتہ نظامِ تمدن میں اس کی اہمیت مسلّم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لیے ہماری سوسائٹی میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی صورت اختیار کر گئی ہے اور مہمان نوازی صرف کاروباری مراسم، رشتے داری نبھانا، شادی بیاہ میں رسماً دعوت پر بلانا وغیرہ کی حد تک محدود ہو گئی ہے۔ اگرچہ گزشتہ مذاہب کی اخلاقی تعلیمات میں مہمان نوازی کا ذکر موجود نہیں ہے، لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا اور مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آنے کے بعد اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۴ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝۲۶ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۷ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۲۸﴾ (الذّٰریٰت)

''(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) کیا ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کا واقعہ آپ تک پہنچا ہے؟ جب وہ ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کہا۔ ابراہیم نے بھی سلام کہا۔ (اور دل میں سوچا کہ) یہ کچھ انجان لوگ ہیں۔ پھر چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹا سا بچھڑا لے آئے۔ تو اسے ان مہمانوں کے سامنے رکھا (اور) کہنے لگے: کیا آپ

* رفیق تنظیم اسلامی، ملیر کراچی

لوگ کھاتے نہیں۔ اس سے ابراہیم نے ان کی طرف سے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔ انہوں نے کہا: ڈریے نہیں، اور انہیں ایک لڑکے کی خوشخبری دی جو بڑا عالم ہوگا۔''

اس واقعہ سے مہمان داری کے متعلق چند آداب ملتے ہیں:

(۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا اسلام سے ہونی چاہیے۔

(۲) مہمان کے کھانے کا فوری انتظام کرنا چاہیے۔

(۳) مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیوں کہ اگر مہمانوں کو معلوم ہو جائے گا تو ازراہِ تکلف وہ اس کو روکیں گے۔

(۴) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام موٹا تازہ بچھڑا ذبح کر کے بھون کر لے آئے۔

(۵) مہمانوں سے نہ کھانے کی وجہ انتہائی ادب کے ساتھ پوچھنی چاہیے۔

(۶) مہمانوں کے نہ کھانے پر مغموم اور پریشان ہونا چاہیے، نہ کہ خوشی محسوس ہو۔

(۷) اگر آپ کسی کے مہمان ہیں اور کسی وجہ سے نہیں کھانا چاہتے تو عمدہ الفاظ میں عذر پیش کریں۔

ہمارے ہاں بالخصوص شہری معاشرے میں مہمان کی آمد پر ناگواری محسوس کی جاتی ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان کا اکرام ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابوشریح خویلد بن عمرو الخزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ)) قَالُوْا: وَمَا جَائِزَتُهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((يَوْمُهُ وَلَيْلَتُهُ، وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ، فَمَا كَانَ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ عَلَيْهِ)) (متفق علیہ)

''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی دستور کے مطابق ہر طرح سے عزت کرے۔'' (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے) پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دستور کے موافق کب تک ہے؟ فرمایا: ''ایک دن اور ایک رات! اور میزبانی تین دن کی ہے، اور جو اس کے بعد ہو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُقِيْمَ عِنْدَ أَخِيْهِ حَتّٰى يُؤْثِمَهُ)) قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! وَكَيْفَ يُؤْثِمُهُ؟ قَالَ: ((يُقِيْمُ عِنْدَهُ وَلَا شَيْءَ لَهُ يُقْرِيْهِ بِهِ)) (رواہ مسلم)

''کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے پاس اس حد تک ٹھہرے کہ اسے گناہ گار ہی کر دے''۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ ﷺ! وہ اسے گناہ گار کیسے کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس کے پاس ٹھہرے حالانکہ اس کی مہمان نوازی کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہو۔''

جان لیجیے کہ مہمان داری کرنا نہ صرف ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت ہے بلکہ نبی آخر الزماں حضرت محمد عربی ﷺ کی تعلیمات مبارکہ میں بھی اس پر خاص زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ احادیث مبارکہ میں سیدنا ہانی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا:

يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ! أَخْبِرْنِيْ بِشَيْءٍ يُوْجِبُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: ((عَلَيْكَ بِحُسْنِ الْكَلَامِ وَبَذْلِ الطَّعَامِ)) (المعجم الكبير: ۴۷۰)

اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسا عمل بتائیں جو جنت واجب کر دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھی بات کرنا اور کھانا کھلانا۔''

آج کے معاشرے میں جہاں سُنّت اور احکامِ دینی کو پسِ پشت ڈالا جا رہا ہے وہیں مہمان داری اور بالخصوص کھانا کھلانے کی سُنّت کو ترک کر دیا گیا ہے۔ خاص طور پر شہری معاشرہ تو مہمان داری گویا جانتا ہی نہیں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ رزق میں برکت ختم ہو گئی ہے اور تنگ دستی کا رونا ہر خاص و عام کی زبان پر جاری ہے۔ برکت لانے والے اعمال میں سے مہمان داری ایک مستقل سبب تھا جسے ترک کر دیا گیا۔ ان ارشادات مبارک پر غور فرمائیں۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا أَبَا ذَرٍّ إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَكْثِرْ مَاءَهَا وَتَعَاهَدْ جِيْرَانَكَ))
(صحيح مسلم: ۶۶۸۸)

''ابوذر! جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ رکھو اور اپنے پڑوسیوں کو یاد رکھو۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلٰى جَنْبِهِ))
(مسند ابي يعلي: ۲۶۹۹)

''وہ شخص مؤمن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔''

مہمان کی تواضع اپنی حیثیت کے مطابق کرنی چاہیے' مگر اب تکلّفات کی وجہ سے مہمان داری کو بوجھ سمجھا جانے لگا ہے۔ چنانچہ اب عمومی طرزِ عمل یہ بن گیا ہے کہ یا تو عمدہ کھانا پیش کرو یا

مہمان داری ہی چھوڑ دو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ میں فاقہ سے ہوں (یعنی کئی دن سے صحیح طرح سے کھانا نہیں ملا ہے)۔ آپ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ کی طرف پیغام بھیجا تو انہوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میرے پاس پانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے دوسری زوجہ کے پاس پیغام بھیجا۔ انہوں نے بھی اسی طرح کہا۔ حتیٰ کہ سب نے یہی کہا: اُس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میرے پاس پانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آخر کار آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص آج رات اس کو مہمان بنائے گا' اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہ ﷺ! اس کو میں مہمان بناؤں گا۔ وہ صحابی اس مہمان کو اپنے گھر لے گئے اور انہوں نے بیوی سے پوچھا: تمہارے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟ بیوی نے کہا: صرف بچوں کا کھانا ہے۔ انہوں نے کہا: بچوں کو کسی چیز سے بہلا دو' جب ہمارا مہمان آئے تو چراغ بجھا دینا اور اس پر یہ ظاہر کرنا کہ ہم بھی کھا رہے ہیں (نہیں تو وہ ہماری غربت دیکھ کر پیٹ بھر کر نہیں کھا سکے گا اور ہمیں بھی اس کھانے میں شریک کرنے کی کوشش کرے گا)۔ پھر وہ سب بیٹھ گئے اور جب کھانا کھانے لگے تو بیوی نے چراغ بجھا دیا اور مہمان نے (اس طرح سے پیٹ بھر کر) کھانا کھا لیا۔ جب صبح کو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے مہمان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اللہ تعالیٰ اس پر بہت خوش ہوا۔'' (صحیح مسلم' کتاب الاشربہ' ح: ۲۰۵۴)

پھر یہ مہمان نوازی صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں' بلکہ اگر کوئی غیر مسلم بھی دروازے پر آ جائے تو اس کی ضیافت کرنی چاہیے اور اسے پیٹ بھر کر کھلانا پلانا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا' جو کافر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے ایک بکری کا دودھ دوہنے کا حکم دیا' اس نے وہ دودھ پی لیا' پھر دوسری بکری کا دودھ دوہنے کا حکم دیا' اس نے اس کو بھی پی لیا۔ حتیٰ کہ اسی طرح وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ پھر صبح کو وہ اسلام لے آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے پھر ایک بکری کا دودھ دوہنے کا حکم دیا' انہوں نے وہ دودھ پی لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دوسری بکری کا دودھ دوہنے کا حکم دیا تو وہ دوسری بکری کا سارا دودھ نہ پی سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن ایک آنت میں پیتا

ہے اور کافر سات آنتوں میں پیتا ہے۔'' (صحیح مسلم' کتاب الاشربہ' ح:۲۰۶۳)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص پاس آئے ہوئے مہمان کی تعظیم وتکریم نہیں کرے گا تو اس کے لیے (عنداللہ) کوئی بھلائی نہیں۔'' (مسند امام احمد بن حنبلؒ)

ہمارے اسلاف کا مزاج بھی یہی رہا ہے کہ دعوت اس کی قبول فرماتے جو تکلّفات نہ کرتا۔ دراصل دعوت کے لیے اہتمام نہیں' بلکہ اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی توجّہ کریں تو یہ کام تقریباً روزانہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کاروبار کے دوران چائے پلانا ویسے ہی معمول ہوا کرتا ہے تو اس میں ضیافت کی نیت کر لیں۔ پھر ملازم پیشہ اکثر حضرات کھانا ساتھ لے جاتے ہیں تو اسے تھوڑا زیادہ کر لیں اور اپنے ساتھ کسی ساتھی کو شامل کر لیں' کسی ملازم کو بٹھا کر اس کو ساتھ کھلا لیں۔ اس طرح کئی فوائد حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ کھانے کا حساب نہیں ہوگا' کچھ خرچ بھی خاص نہیں ہوگا اور ابوالانبیاء ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت بھی تازہ ہوگی کہ حضرت خلیل اللہ مہمان کے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔ پھر مشاہدہ گواہ ہے کہ ایسا معمول رکھنے والے حضرات کے رزق میں برکت اور روز افزوں اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اسی طرح لوگوں کو کھانا کھلانے والے افراد جب باقاعدگی سے یہ کام کرتے رہے تو کھانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے' کبھی کمی نہیں کی۔ یہ وہ برکات ہیں جس سے وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جو خالص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے عمل کرے' دکھلاوا مقصود نہ ہو' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝﴾ (الدھر)

''(ان سے کہتے ہیں) ہم تو تمہیں خاص اللہ کے لیے کھانا کھلاتے ہیں' تم سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری نہیں مانگتے۔ بے شک ہمیں اپنے رب سے ایک ایسے دن کا ڈر ہے جو بہت تُرش' نہایت سخت ہے۔''

[اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ: ہم تمہیں خاص اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔]

اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کے نیک بندے ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں خاص اس غرض سے کھانا کھلاتے ہیں تاکہ ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ اور بے شک ہمیں اپنے رب عزّوجل سے ایک ایسے دن کا ڈر ہے جس میں کافروں کے چہرے

نہایت سخت بگڑے ہوئے ہوں گے' لہٰذا ہم اپنے عمل کی جزا یا شکر گزاری تم سے نہیں چاہتے' بلکہ ہم نے یہ عمل اس لیے کیا ہے تاکہ ہم اس دن خوف سے امن میں رہیں۔ (تفسیر کبیر)

مہمان داری کی اہمیت اور اس کے آداب جان لینے کے بعد اب آخر میں مہمان بننے یعنی دعوت قبول کرنے اور نہ کرنے کے چند اہم اصول یاد رکھنے چاہئیں۔ شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ اپنے ''اصلاحی خطبات'' میں رقم طراز ہیں:

''دعوت اس نیت سے قبول کرے کہ یہ میرا بھائی ہے اور مجھے محبت سے بلا رہا ہے' اس کی محبت کی قدر دانی ہو جائے اور اس کا دل خوش ہو جائے۔ دعوت قبول کرنا سُنّت ہے اور باعثِ اجر وثواب ہے۔ مزید فرماتے ہیں: دعوت قبول کرنا اس وقت سُنّت ہے جب دعوت قبول کرنے کے نتیجے میں کسی معصیت کا ارتکاب اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو' مثلاً کسی ایسی جگہ کی دعوت قبول کر لی جہاں گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو رہا ہے' اب ایک سُنّت پر عمل کرنے کے لیے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا جا رہا ہے' ایسی دعوت قبول کرنا سُنّت نہیں۔ آج کل ان میں معصیتیں ہو رہی ہیں' منکرات ہو رہے ہیں' گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ ''ولیمہ مسنونہ'' تو لکھ دیا یہ معلوم نہیں کہ کیا طریقہ ہے۔ چنانچہ بے پردگی ہو رہی ہے' مَردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہے' گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے اور اس پر ستم یہ کہ اگر کسی وقت کوئی اللہ کا بندہ اسٹینڈ لے کر خاندان والوں سے یہ کہتا ہے کہ اگر اس گناہ کا ارتکاب ہوگا تو مَیں اس دعوت میں شریک نہیں ہوں گا تو اُسے دقیانوس اور شدّت پسند کا لقب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض حضرات یہ کہہ کر شرکت کر لیتے ہیں کہ ہم خاندان اور معاشرے سے کٹ جائیں گے۔ حضرت فرماتے ہیں: اگر گناہوں سے بچنے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خاطر خاندان سے کٹنا پڑے تو کٹ جاؤ' یہ سودا نفع کا ہے۔ جو شخص دین کے اصولوں کے خلاف دعوت رکھے اس کی دعوت قبول کرنا مناسب نہیں بلکہ گناہ ہے۔ اگر خاندان کے کچھ لوگ ڈٹ جائیں تو ان منکرات کو روکا جا سکتا ہے' بصورت دیگر کوئی بعید نہیں کہ مغربی تہذیب کی لعنتیں ہمارے معاشرے پر بھی پوری طرح مسلّط ہو جائیں گی۔''

اے اللہ! ہمیں ان تمام باتوں کو سمجھنے اور مہمان کا اکرام کرنے کی توفیق عطا فرما تاکہ ہم ایمان کی اس شاخ سے خوب حصّہ پائیں۔ آمین!

❁❁❁

عقیقہ: احکام وفضائل

احمد علی محمودی

عقیقہ کے معنی

عقیقہ عقّ سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی پھاڑنے کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں عقیقہ اس جانور کو کہا جاتا ہے جو نومولود کی پیدائش پر ساتویں دن اس نعمت یا رحمت کے اظہار کے طور پر ذبح کیا جائے۔ عقیقہ کا دوسرا نام نسیکہ یا ذبیحہ ہے۔ عقیقہ سے اسلام کے ایک شعار کا اظہار ہوتا ہے، اللہ کی بڑائی اور اس کی حمد وثنا بھی ہوجاتی ہے۔ خالص اللہ کی رضا کے لیے عقیقہ کرنے سے اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور بچے کے بہت سے دنیاوی اور دینی امور ربّ العالمین کی توفیق سے سہل ہوجاتے ہیں۔

عقیقہ سُنّتِ مؤکدہ

عقیقہ کرنا بعض اہلِ علم کے نزدیک احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں سُنّتِ مؤکدہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَأَحَبَّ أن يَنسُكَ عَنْهُ فَلْيَنْسُكْ)) (سنن ابی داؤد)

''جس کے ہاں بچے کی ولادت ہو اور وہ اس کی طرف سے قربانی (عقیقہ) کرنا چاہتا ہو تو وہ کرے۔''

یہاں اَحَبَّ کا لفظ بتلا رہا ہے کہ عقیقہ واجب نہیں ہے۔ اس سے بعض اہلِ علم نے استحباب کا حکم اخذ کیا ہے جبکہ دیگر احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے سُنّت مؤکدہ کا حکم راجح معلوم ہوتا ہے۔

عقیقہ اور دیگر اقوام

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہودیوں کے یہاں بھی عقیقہ کا رواج تھا مگر صرف لڑکوں کی طرف سے۔ اسلام نے لڑکے کی طرف سے دو جانور اور لڑکی کی طرف سے ایک جانور ذبح

کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے ایک طرف جہاں عورتوں کا مقام ومرتبہ بلند ہوتا ہے تو دوسری طرف عربوں یا دیگر قوموں کے ہاں عورتوں کی نحوست کا عقیدہ بھی خود بخود باطل ہوجاتا ہے۔

بچی کی پیدائش کی خوشی میں عقیقہ کرنا

اسلام اپنے ماننے والوں کو نعمت یا رحمت ملنے پر اس کے اظہار کا بعض مواقع پر حکم دیتا ہے، ان میں سے ایک موقع بچہ یا بچی کی پیدائش بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی قدر اس سے پوچھیں جو اولاد سے محروم ہے۔ اکثر لوگ بچی کی پیدائش پر مرجھا جاتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں جو بیٹیوں کی پیدائش پر خوشی کے بجائے غم مناتے ہیں یا ماں کے پیٹ میں بچی کا علم ہونے پر اسقاط کروادیتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بچی کی پیدائش رحمت اور اس کی صحیح تعلیم وتربیت حصولِ جنت کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف بچے بلکہ بچی کی پیدائش پر بھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے عقیقہ کرنا چاہیے۔

عقیقہ کے فوائد وبرکات

- زندگی کی ابتدائی سانسوں میں نومولود بچہ/ بچی کے نام سے خون بہا کر اللہ تعالیٰ سے اس کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے۔
- یہ اسلامی ویکسی نیشن (vaccination) ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بعض پریشانیوں، آفتوں اور بیماریوں سے راحت مل جاتی ہے۔ ہمیں دنیاوی ویکسی نیشن کے ساتھ اس ویکسی نیشن کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔
- بچہ/ بچی کی پیدائش پر جو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ورحمت ہے، خوشی کا اظہار ہوجاتا ہے۔
- بچہ/ بچی کا عقیقہ کرنے پر کل قیامت کے دن باپ بچہ/ بچی کی شفاعت کا مستحق بن جائے گا، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں مذکور ہے۔
- عقیقہ کی دعوت سے رشتے دار، دوست واحباب اور دیگر متعلقین کے درمیان تعلق بڑھتا ہے، جس سے ان کے درمیان محبت والفت پیدا ہوتی ہے۔

عقیقہ کے متعلق احادیث

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بچہ/ بچی کے لیے عقیقہ ہے، اس کی جانب سے تم

خون بہاؤ اور اس سے گندگی (سر کے بال) کو دور کرو۔'' (صحیح بخاری)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر بچہ/ بچی اپنا عقیقہ ہونے تک گروی ہے۔ اس کی جانب سے ساتویں دن جانور ذبح کیا جائے' اس دن اس کا نام رکھا جائے اور سر منڈوایا جائے۔'' (ترمذی' ابن ماجہ' نسائی' مسند احمد)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درج بالا فرامین کی شرح میں علماء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ کل قیامت کے دن بچہ/ بچی کو باپ کے لیے شفاعت کرنے سے روک دیا جائے گا' اگر باپ نے استطاعت کے باوجود بچہ/ بچی کا عقیقہ نہیں کیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حتی الامکان بچہ/ بچی کا عقیقہ کرنا چاہیے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لڑکے کی جانب سے دو بکریاں اور لڑکی کی جانب سے ایک بکری (عقیقہ) ہے۔'' (ترمذی' مسند احمد)

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لڑکے کی جانب سے دو بکرے اور لڑکی کی جانب سے ایک بکرا ہے۔ عقیقہ کے جانور مذکر ہوں یا مؤنث' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا (یعنی بکرا یا بکری جو چاہیں ذبح کر دیں)۔'' (ترمذی' مسند احمد)

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نواسوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کا عقیقہ ساتویں دن کیا' اسی دن ان کا نام رکھا اور حکم دیا کہ ان کے سروں کے بال مونڈ دیے جائیں۔ (ابوداؤد)

عقیقہ کے بدلے گروی کا مفہوم

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْغُلَامُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيْقَتِهٖ يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُسَمّٰى وَيُحْلَقُ رَأْسُهُ))

(مشکاۃ المصابیح' ج ۲' ص ۴۴۴)

''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہے' (اس کی پیدائش کے) ساتویں دن اس کے (عقیقہ کے) لیے (جانور) ذبح کیا جائے' (ساتویں ہی دن) اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈھا جائے۔''

اس حدیث کی شرح میں علامہ نواب قطب الدین خان دہلویؒ ''مظاہرِ حق'' میں لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ بچہ چونکہ مکلّف نہیں ہے کہ اگر اس کا عقیقہ نہ کیا جائے تو اس کے ماخوذ و معتوب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا' اس صورت میں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر عقیقہ کے عوض بچے کے گروی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ چنانچہ حضرت امام احمدؒ نے تو اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہیں ہوتا اور وہ کم سنی میں مرجاتا ہے تو اس کو اپنے والدین کی شفاعت کرنے سے روک دیا جاتا ہے کہ جب تک والدین اس کا عقیقہ نہ کر دیں' وہ اس کے حق میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں ہوگا۔ بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ جب تک والدین بچہ کا عقیقہ نہیں کرتے اس کو بھلائیوں' سلامتی آفات اور بہتر نشوونما سے باز رکھا جاتا ہے' اور پھر اس کے جو برے نتائج پیدا ہوتے ہیں' وہ حقیقت میں والدین کے مواخذہ کا سبب بنتے ہیں کہ ترکِ عقیقہ انہوں نے ہی کیا ہے۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ گروی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بچہ اپنے بالوں وغیرہ کی گندگی و اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے: ((فأميطوا عنه الأذى)) ''بچے سے اذیت کو ہٹاؤ'' (یعنی اس کے بال میل کچیل اور خون وغیرہ صاف کرو) لہٰذا جب بچہ کا عقیقہ ہوتا ہے تو وہ گویا سر کے بال وغیرہ صاف ہو جانے سے اس اذیت سے نجات پا جاتا ہے۔''

عقیقہ' بچے کی طرف سے خون بہانا

حضرت سلمان بن عامر الضبی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ فَأَهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا وَأَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذٰى))

(صحيح البخاری۔ سنن الترمذی)

''لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے' لہٰذا اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس سے تکلیف کو دور کرو۔''

مذکورہ و دیگر احادیث کی روشنی میں علمائے کرام فرماتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کرنا' بال منڈوانا' نام رکھنا اور ختنہ کرانا سُنّت ہے' لہٰذا باپ کی ذمہ داری ہے کہ اگر وہ اپنے نومولود بچہ/ بچی کا عقیقہ کر سکتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سُنّت کو ضرور زندہ کرے تاکہ عنداللہ اجرِ عظیم کا مستحق بنے' نومولود بچہ/ بچی کو اللہ کے حکم سے بعض آفتوں اور بیماریوں سے راحت مل سکے' نیز کل قیامت کے دن بچہ/ بچی کی شفاعت کا مستحق بن سکے۔

کیا ساتویں دن عقیقہ کرنا شرط ہے؟

عقیقہ کرنے کے لیے ساتویں دن کا اختیار کرنا مستحب ہے۔ ساتویں دن کو اختیار کرنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ زمانہ کے ساتوں دن بچہ/ بچی پر گزر جاتے ہیں' لیکن ساتویں دن ممکن نہ ہو تو ساتویں دن کی رعایت کرتے ہوئے چودھویں یا اکیسویں دن کرنا چاہیے' جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ اگر کوئی شخص ساتویں دن کے بجائے چوتھے یا آٹھویں یا دسویں دن یا اس کے بعد کبھی بھی عقیقہ کرے تو یقیناً عقیقہ کی سُنّت ادا ہو جائے گی' اس کے فوائد ان شاء اللہ حاصل ہو جائیں گے' اگرچہ عقیقہ کا مستحب وقت چھوٹ گیا ہو۔

بچہ/ بچی کے عقیقہ میں فرق کیوں رکھا گیا؟

اسلام نے عورتوں کو معاشرہ میں ایک ایسا اہم اور باوقار مقام دیا ہے جو کسی بھی سماوی یا خودساختہ مذہب میں نہیں ملتا' لیکن پھر بھی قرآن کی آیات: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط﴾ (البقرۃ:۲۲۸)' ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (النساء:۳۴) اور احادیث شریفہ کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے مَردوں کو عورتوں پر کسی درجہ میں فوقیت دی ہے' جیسا کہ دنیا کے وجود سے لے کر آج تک ہر قوم میں اور ہر جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے بچہ کے عقیقہ کے لیے دو اور بچی کے عقیقہ کے لیے ایک خون بہانے کا جو حکم دیا ہے' اس کی حقیقت خالقِ کائنات ہی بہتر جانتا ہے۔

کیا عقیقہ میں بکرا/ بکری کے علاوہ دیگر جانور کو ذبح کیا جاسکتا ہے؟

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے مگر تحقیقی بات یہ ہے کہ حدیث (۱ اور ۲) کی روشنی میں بکرا/ بکری کے علاوہ اونٹ یا گائے کو بھی عقیقہ میں ذبح کرسکتے ہیں' کیونکہ اس حدیث میں عقیقہ میں خون بہانے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بکرا/ بکری کی کوئی شرط نہیں رکھی۔ نیز عقیقہ کے جانور کی عمر وغیرہ کے لیے تمام علماء نے عیدالاضحیٰ کی قربانی کے جانور کی شرائط تسلیم کی ہیں۔

کیا اونٹ یا گائے وغیرہ کے حصّہ میں عقیقہ کیا جاسکتا ہے؟

اگر کوئی شخص اپنے دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کا عقیقہ ایک گائے کی قربانی میں کرنا چاہے' یعنی قربانی کی طرح حصوں میں عقیقہ کرنا چاہے' تو اس کے جواز سے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔

علمائے کرام نے قربانی پر قیاس کر کے اس کی اجازت دی ہے' البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ ہر بچہ/ بچی کی طرف سے کم از کم ایک خون بہایا جائے۔

کیا بالغ مرد و عورت کا بھی عقیقہ کیا جاسکتا ہے؟

جس شخص کا عقیقہ بچپن میں نہیں کیا گیا' لیکن اسے بڑی عمر میں اس کا شعور ہو رہا ہے تو وہ یقیناً اپنا عقیقہ کرسکتا ہے' کیونکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت ملنے کے بعد اپنا عقیقہ کیا۔ (اخرجه ابن حزم فی "المحلّی" والطحاوی فی "المشکل") نیز احادیث میں کسی بھی جگہ عقیقہ کرنے کے آخری وقت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ بڑی بچی کے سر کے بال منڈوانا جائز نہیں۔ ایسی صورت میں بال نہ کٹوائیں' کیونکہ اس کے بغیر بھی عقیقہ کی سُنّت ادا ہو جائے گی۔

دیگر مسائل

قربانی کے جانور کی طرح عقیقہ کے جانور کی کھال یا تو غرباء و مساکین کو دے دیں یا اپنے گھریلو استعمال میں لے آئیں۔ کھال یا کھال کو فروخت کر کے اس کی قیمت قصائی کو بطور اجرت دینا جائز نہیں۔ قربانی کے گوشت کی طرح عقیقہ کے گوشت کو خود بھی کھا سکتے ہیں اور رشتہ داروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ اگر قربانی کی طرح عقیقے کے گوشت کے تین حصّے کر لیے جائیں تو بہتر ہے: ایک اپنے لیے' ایک رشتے داروں کے لیے اور تیسرا حصّہ غریبوں کے لیے' لیکن یہ تین حصے کرنا کوئی ضروری نہیں۔ عقیقہ کے گوشت کو پکا کر رشتے داروں کو بلا کر بھی کھلا سکتے ہیں اور کچا گوشت بھی تقسیم کرسکتے ہیں۔

حاصلِ کلام

بچہ ہو یا بچی ہر کسی کی پیدائش پر عقیقہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیارے نواسوں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی جانب سے عقیقہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ اس سُنّت کو زندہ کیے رہے۔ لہٰذا ہمیں بھی اس سُنّت کا پاس و لحاظ کرنا چاہیے۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھیں کہ اگر ساتویں دن عقیقہ کی طاقت نہیں تو نہ کریں' کسی سے قرض لینے کی بھی ضرورت نہیں' مگر جب اللہ تعالیٰ آسانیاں فراہم کرے تب اپنے بچہ کی جانب سے عقیقہ کرنے میں سستی یا غفلت نہ کریں۔ ❁❁❁

صلہ رحمی کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حسنِ سلوک اسلامی اخلاق کا ایک اہم عنوان ہے۔ مسلمان وہ ہے جو ہر کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے اور دوسروں کو تکلیف نہیں دیتا۔ انسان کے حسنِ سلوک کے سب سے زیادہ مستحق اس کے اقارب یعنی قریبی رشتہ دار ہیں۔ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں تو یہ خوشیوں میں شریک ہو کر اس کی رونق کو دوبالا کر دیتے ہیں جبکہ مصیبتوں اور بیماریوں میں خیر خواہی کا باعث بنتے ہیں۔ یوں بُرے حالات میں انسان اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور بے سہارا نہیں پاتا۔ حسنِ سلوک کے باعث آپس میں اتفاق و اتحاد اور پیار محبّت بڑھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس پر شاہد ہے آپؐ کا سلوک اپنے اقارب کے ساتھ مثالی تھا۔ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ''مجھے معلم اخلاق بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

اقارب میں اوّلین ماں باپ ہیں اور اس کے بعد بہن بھائی اور والدین کی وساطت سے دوسرے رشتہ دار یعنی چچا، خالہ، ماموں، پھوپھی اور ان کی اولاد وغیرہ ہیں۔ والدین کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ﴾ (العنکبوت:۸)

''ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔''

اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۴ میں توحید کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ﴾

''تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔''

والدین کے بعد قریب ترین رشتے وہ ہیں جو ماں باپ کی نسبت سے وجود میں آتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکمِ ربانی ہے: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ﴾ (النساء:۱) ''اُس اللہ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتے ناتے توڑنے سے بھی بچو!'' جس طرح قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اسی طرح ان کے ساتھ بدسلوکی پر شدید وعید ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ (البقرۃ)

''جو توڑ دیتے ہیں اللہ کے (ساتھ کیے ہوئے) عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد اور کاٹتے ہیں اُس چیز کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے کئی تاکیدی حکم ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگرچہ تمہارے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''احسان کا بدلہ احسان سے ادا کرنے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ جب اس سے رشتہ قطع کیا جائے تو وہ اس کو جوڑے۔'' (صحیح البخاری عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما)

رسول اللہ ﷺ نے جہاں شرک سے دور رہنے، نماز پنج گانہ ادا کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے کو جنّت کی بشارت دی وہاں صلہ رحمی کو بھی بخشش کا باعث فرمایا ہے۔ حضرت خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

اَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِيْ مِنَ النَّارِ۔ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ وَتَصِلُ الرَّحِمَ)) (متفق علیہ)

''ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے ایسا عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور کر دے۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔''

اسلام قبول کرنے سے پہلے ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں رسول اللہ ﷺ کا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کرنے، شرک نہ کرنے اور باپ دادا کی پیروی نہ کرنے کا

کہتے ہیں۔ نیز نماز پڑھنے' سچائی اور پاک دامنی اختیار کرنے اور صلہ رحمی کا حکم فرماتے ہیں۔ (ماخوذ من الصحیحین عن ابی سفیان صخر بن حرب) قریبی رشتوں کا تعلق رِحم سے ہوتا ہے جو ماں کے پیٹ میں ایک عضو ہے جس میں بچہ پرورش پاتا ہے جبکہ رَحم کا معنی مہربانی اور ہمدردی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رِحم (رشتہ) عرشِ الٰہی میں معلق ہے اور کہتا رہتا ہے کہ جو شخص مجھ کو ملائے گا اس کو اللہ تعالیٰ ملائے گا اور جو مجھے قطع کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قطع کرے گا۔'' (متفق علیہ عن عائشۃ الصدیقہ ؓ) یہ چیز پسندیدہ ہے کہ جو شخص صدقہ یا خیرات کرے' وہ پہلے اپنے رشتہ داروں کی ضرورت دیکھے کیونکہ اس طرح اس کا ثواب کئی گنا ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رشتہ دار کے لیے دو باتیں ہیں یعنی دگنا ثواب ہے: ایک صدقہ کا' دوسرا صلہ رحمی کا''۔ (رواہ الترمذی' عن سلمان بن عامر ؓ)

اُمّ المومنین حضرت میمونہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے اپنی باندی آزاد کر دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم اپنی یہ باندی اپنے ماموں کو دے دیتیں تو یہ تمہارے لیے زیادہ ثواب کا باعث ہوتا۔'' (متفق علیہ)

عقلِ سلیم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ صدقہ و خیرات کرتے وقت اپنے اقارب میں سے مستحقین کو اوّلیت دی جائے' اگرچہ وہ کافر اور مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت اسماء بنتِ ابوبکر ؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں میری والدہ مجھ سے کچھ طلب کرنے کے لیے مکہ سے مدینہ آئیں۔ وہ مشرکہ تھیں۔ مَیں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ سے کچھ طلب کرنے کی خواہش مند ہیں۔ کیا مَیں اپنی ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں اپنی ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔'' (متفق علیہ)

نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا: اللہ تعالیٰ نے کیا چیز دے کر آپؐ کو مبعوث فرمایا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صلہ رحمی کرنے اور بتوں کو توڑنے کا حکم دے کر۔'' (صحیح البخاری عن عمرو بن عبسہ ؓ)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَاطِعٌ)) (عن ابی محمد جبیر بن مطعم ؓ)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے قاطع رحم کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت میں داخل نہ

ہوگا۔ اس حدیث کو پڑھ کر تو ہر مسلمان کو عہد کر لینا چاہیے کہ چاہے اس کے رشتہ دار اس کے ساتھ کیسا ہی سلوک کریں' وہ ان کے ساتھ تعلقات ہرگز قطع نہ کرے گا۔

حضرت ابوبکر صدّیق ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سرکشی کرنا اور قطع رحمی کرنا (ایسے گناہ ہیں کہ) کوئی گناہ ان سے زیادہ اس بات کا مستحق نہیں کہ اس کا ارتکاب کرنے والے کو خدا تعالیٰ جلدی سے دنیا میں بھی سزا دے دے' علاوہ اس سزا کے جو اس نے اس کے لیے آخرت میں رکھی ہے۔'' (سنن ابی داؤد)

اگر غور کیا جائے تو رشتہ داری کا مطلب ہی یہ ہے کہ اقرباء آپس کے تعلقات مضبوط رکھیں' ایک دوسرے کی خوشی میں شامل ہوں۔ اگر کسی کو صدمہ پہنچے تو اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں۔ اگر کوئی ضرورت مند' غریب' مسکین ہو تو اس کی مدد کریں۔ اگر کوئی رشتہ داروں کی قدر نہ کرے گا تو وہ تنہا رہ جائے گا۔ یہ سزا اسے دنیا ہی میں مل جائے گی۔ بعض اوقات رشتہ داروں کی آپس کی ناراضگیاں بڑھتے بڑھتے دشمنی میں بدل جاتی ہیں جس کا نقصان کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ اس لیے اپنے رشتہ داروں کی غلطیوں اور خطاؤں سے درگزر کا رویہ اپنانا چاہیے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ صلہ رحمی سے دنیا کی زندگی میں بھی سہولت پیدا ہوتی ہے جبکہ آخرت میں یہ ثواب کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ کسی کی طرف سے اگر بدسلوکی کا مظاہرہ ہو تو بھی جواباً اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ یہی مردانگی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کا رزق کشادہ ہو اور اس کی عمر میں برکت ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔'' (بخاری عن انس بن مالک)

حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نسب کی اتنی تعلیم حاصل کر لو جس سے اپنے رشتہ داروں کو جان سکو' کیونکہ صلہ رحمی سے اپنے لوگوں میں محبّت پیدا ہوتی ہے' مال بڑھتا ہے' اور موت پیچھے ہٹتی ہے۔'' (ترمذی)

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

تفسیر اور تاویل اور ان کا باہمی فرق

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۱۱)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

تفسیر کا لغوی مفہوم

تفسیر کے لغوی معنیٰ واضح کرنے اور کھول کر بیان کرنے کے ہیں۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾﴾

''وہ جو مثال بھی آپ کے پاس لائیں گے، ہم اس کے بدلے آپ کے پاس حق اور اس کی بہترین وضاحت لائیں گے۔''

اس آیت میں تفسیر سے مراد بیان اور تفصیل ہے۔ لفظ تفسیر کا مادہ ''فسر'' ہے اور اس کے معنی ظاہر کرنا، کھول دینا اور بے حجاب کرنا کے ہیں۔ فسرٌ مصدر ہے جو فعل ضَرَبَ اور نَصَرَ دونوں کے وزن پر آتا ہے (القاموس)۔ صاحبِ لسان العرب کا کہنا ہے کہ فسر کے معنی ہیں اظہار و بیان، تفسیر کا مفہوم بھی یہی ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ فسر بے حجاب کرنے کو کہتے ہیں، تفسیر کرتے وقت بھی مشکل الفاظ کے معنی و مفہوم کو گویا بے حجاب کر دیا جاتا ہے۔ مشہور مفسر اور نحوی ابوحیان لکھتے ہیں کہ سواری کا پالان اُتار کر اس کی پیٹھ ننگی کرنے کو بھی تفسیر کہتے ہیں۔ ثعلب نحوی کا بھی یہی قول ہے، ظاہر ہے کہ ننگا کرنے میں کشف و اظہار کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس لیے کہ زین اتارنے سے پیٹھ کھل کر سامنے آجاتی ہے (البحر المحیط)۔ تفسیر کے معنی کشف و اظہار کے بھی ہیں، چونکہ اس علم میں قرآن پاک کے مطالب و معانی کی توضیح کی جاتی ہے، اس لیے یہ علم اس نام سے موسوم ہوا۔ اگرچہ دوسرے علوم میں بھی کشف و بیان پایا جاتا ہے مگر یہ نام اسی علم کے ساتھ مخصوص ہے، اس لیے کہ یہ علم جلیل القدر اور زیادہ استعداد کا محتاج ہے۔ اس میں یہ بیان کیا جاتا

ہے کہ ارشادِ خداوندی سے مراد کیا ہے۔ گویا کشف و اظہار کا حامل صرف یہی علم ہے، کوئی دوسرا نہیں (مناہل العرفان)۔ مذکورہ دلائل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ لفظ تفسیر بلحاظ لغت محسوسات اور معقولات دونوں کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے، البتہ عقلی اور غیر مادی اشیاء کے لیے یہ لفظ مقابلتاً زیادہ مستعمل ہے۔

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم

بعض علماء تفسیر کا شمار ان علوم میں نہیں کرتے جن کے لیے کسی جامع و مانع تعریف کی ضرورت ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم تفسیر دیگر علوم کی طرح کچھ لگے بندھے قواعد اور خاص ملکہ کا نام نہیں جو کسی علم کے بکثرت تکرار و اعادہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے عقلی علوم اور علم تفسیر کے مابین کوئی خاص مماثلت نہیں پائی جاتی، چنانچہ ان کے نزدیک علم تفسیر کی تعریف کی کوئی ضرورت نہیں، صرف یہ کہنا کافی ہے کہ علم تفسیر کلام اللہ کی تشریح و توضیح کا نام ہے، یا یہ کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جو قرآن مجید کے الفاظ و معانی واضح کرتا اور کھولتا ہے۔

بخلاف ازیں علماء کی ایک دوسری جماعت اس بات کی قائل ہے کہ تفسیر کا تعلق ان مسائل جزئیہ یا قواعدِ کلیہ یا اس ملکہ رُاسخہ کے ساتھ ہے جو قواعد کے تحفظ و نگہداشت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس علم کے لیے تعریف کی بھی ضرورت ہے، نیز فہمِ قرآن کے ضمن میں دیگر علوم مثلاً لغت و قراءت اور صرف و نحو وغیرہ بھی مطلوب ہیں۔ جن علماء نے علمِ تفسیر کی جامع و مانع تعریف بیان کی ہے، وہ مختلف الآراء ہیں اور کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہو سکے، تاہم اختلاف و تنوع کے باوصف یہ تعریفاتِ کثیرہ لفظاً مختلف لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے متحد ہیں۔

(۱) ابوحیان نے البحر المحیط میں تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظِ قرآن کے تلفظ، ان کے مفہوم و مدلول، ان کے احکامِ افرادی و ترکیبی اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جن کے حالت ترکیب میں وہ حامل ہوتے ہیں اور ان کے تتمات کا بیان کیا جاتا ہے۔ اب اس تعریف میں جو قیود ہیں، ان کے فوائد بتاتے ہوئے ابوحیان کا کہنا ہے کہ اس تعریف میں 'علم' کا لفظ جنس کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سب علوم شامل ہیں۔ جیسے علم القراءت سے قرآنی الفاظ کے نطق و تلفظ کا پتہ چلتا ہے، الفاظ کے معانی و مفہوم علم لغت سے معلوم ہوتے ہیں جن کی تفسیر میں اشد ضرورت پڑتی ہے، الفاظ

کے احکامِ افرادی وترکیبی کا حال علومِ صرف ونحو اور بیان وبدیع بتاتے ہیں۔ باقی رہی یہ قید کہ حالت ترکیب میں الفاظ جن معانی کے حامل ہوتے ہیں تو اس سے حقیقی ومجازی معانی مراد ہیں' اس لیے کہ بعض الفاظ کی ترکیب ایک خاص معنی کی متقاضی ہوتی ہے مگر ظاہراً ایک ایسا مانع موجود ہوتا ہے جو حقیقی معنی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے' تو اس لیے مجازی مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ تتمہ وضمیمہ کے لفظ سے ناسخ ومنسوخ اور سبب نزول کی پہچان نیز ایسا واقعہ مراد ہے جو مبہماتِ قرآن کی وضاحت کرتا ہو۔

(ب) تفسیر کی تعریف امام زرکشی نے یوں کی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے نبی اکرم ﷺ پر نازل شدہ اللہ کی کتاب ''قرآن'' کے معانی سمجھے جاتے ہیں اور اس کے احکام ومسائل اور اسرار وحکم (کا استنباط کر کے ان) سے بحث کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں علم لغت' نحو' صَرف' علم بیان' قراءت اور اصولِ فقہ سے مدد لی جاتی ہے' اسبابِ نزول اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ (البرہان)

(ج) تفسیر کی ایک تعریف اس طرح سے بیان ہوئی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں بشری استطاعت کی حد تک اس امر سے بحث کی جاتی ہے کہ الفاظِ قرآنی سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے۔ (منہج الفرقان)

(د) تفسیر کی ایک اور تعریف کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں قرآنی آیات کے نزول' ان کے واقعاتِ متعلقہ و اسباب نزول نیز مکی ومدنی' محکم و متشابہ' ناسخ ومنسوخ' خاص وعام' مطلق ومقید' مجمل ومفسر' حلال وحرام' وعد ووعید' امر ونہی اور عبرت وامثال وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ (الاتقان)

(ہ) تفسیر کی ایک تعریف یوں بھی ہے کہ تفسیر کا تعلق پیروی اور سماع سے ہے اور تاویل کا تعلق استنباط سے۔

مذکورہ تعریفات میں یہ بات قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی استطاعت کی حد تک مرادِ الٰہی کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' بنابریں تفسیر ہر اس علم کو بھی سموئے ہوئے ہے جس پر قرآن مجید کی مراد اور مقصود کا سمجھنا موقوف ہو۔

مفتی محمد تقی عثمانی کے بقول لفظ تفسیر دراصل فَسْرٌ سے نکلا ہے' جس کے معنی ہیں کھولنا' اور

اس علم میں چونکہ قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے' اس لیے اسے علم تفسیر کہتے ہیں' چنانچہ قدیم زمانے میں تفسیر کا اطلاق قرآن مجید کی تشریح پر ہی ہوتا تھا۔ عہد رسالت کے قرب اور علوم کے اختصار کی بنا پر اس علم میں زیادہ شاخیں نہیں تھیں' لیکن جب علم تفسیر نے ایک مدوّن علم کی صورت اختیار کی اور مختلف پہلوؤں سے اس میں پھیلاؤ آیا اور اس کی فکری خدمت ہوتی گئی تو یہ ایک انتہائی وسیع اور پہلو دار علم بن گیا۔ اب 'علم تفسیر' جن تفصیلات کو شامل ہے اس کی اصطلاحی تعریف یوں ہے کہ

> ''علم تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظِ قرآنی کی ادائیگی کے طریقے' ان کے مفہوم' ان کے افرادی اور ترکیبی احکام اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جو ان الفاظ سے ترکیبی حالت میں مراد لیے جاتے ہیں۔ نیز ان معانی کا تکملہ' ناسخ ومنسوخ' شانِ نزول اور مبہم قصوں کی توضیح کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔'' (روح المعانی)

اس تعریف کی روشنی میں علم تفسیر درج ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے' یعنی الفاظِ قرآن کو کس کس طریقے سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اسی کی وضاحت کے لیے قدیم عربی مفسرین اپنی تفسیروں میں ہر آیت کے ساتھ اس کی مختلف قراءتیں تفصیل سے بتاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ایک مستقل علم 'قراءت' کے نام سے بھی موجود ہے۔

(۲) الفاظِ قرآنی کے مفہوم یعنی ان کے لغوی معنی' اس کام کے لیے علم لغت سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے' اور اسی بنا پر کتب تفاسیر میں علمائے لغت کے حوالے اور عربی ادب کے شواہد بکثرت ملتے ہیں۔

(۳) الفاظ کے انفرادی احکام' یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا مادّہ کیا ہے' یہ موجودہ صورت میں کس طرح سے آیا ہے' اس کا صرفی وزن کیا ہے اور اس وزن کے معانی وخواص کیا ہیں۔ ان تمام باتوں کے لیے 'علم الصرف' کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۴) الفاظ کے ترکیبی احکام' یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ پتہ ہونا کہ وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنی دے رہا ہے' اس کی نحوی ترکیب کیا ہے' اس پر موجودہ حرکات اور اعراب کیوں آئے ہیں اور کن معانی پر دلالت کر رہے ہیں۔ اس سارے کام کے لیے

'علم النحو' اور 'علم المعانی' سے مدد لی جاتی ہے۔

(۵) ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی' یعنی پوری آیت اپنے سیاق وسباق میں کیا معنی اور مفہوم دے رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے آیت کے مضامین کے لحاظ سے مختلف علوم سے مدد لی جاتی ہے۔ مذکورہ علوم کے علاوہ بعض اوقات علم ادب اور علم بلاغت سے کام لیا جاتا ہے اور بسا اوقات علم حدیث یا علم اصول فقہ سے بھی مدد لی جاتی ہے۔

(۶) معانی کے تکملے' یعنی آیات قرآنی کا پس منظر اور جو بات قرآن حکیم میں مجمل ہے اس کی تفصیل وغیرہ' اس غرض کے لیے زیادہ تر علم حدیث سے کام لیا جاتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ بھی یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیا کے ہر علم وفن کی معلومات کھپ سکتی ہیں' کیونکہ بعض اوقات قرآن حکیم میں ایک مختصر سا جملہ ارشاد ہوتا ہے لیکن اس میں حقائق واسرار کی ایک غیر متناہی کائنات پوشیدہ ہوتی ہے' مثلاً سورۃ الذاریات میں فرمان الٰہی ہے: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور تمہاری اپنی ذات (جان) میں بھی (نشانیاں ہیں)' تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' اب غور کریں کہ اس مختصر سے جملے کی تشریح وتوضیح میں مکمل علم الابدان اور پورا علم نفسیات سما سکتا ہے' اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی تخلیقی حکمت بالغہ کے جن اسرار کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ سب پورے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ تفسیر کے اس ذیلی جزو میں عقل وتدبر اور تجربات ومشاہدات کے ذریعے انتہائی متنوع مضامین شامل ہو جاتے ہیں۔

تاویل کا لغوی مفہوم

لفظ تاویل کا سہ حرفی مادہ اول (رجوع کرنا) ہے۔ اس ضمن میں صاحب قاموس کا کہنا ہے: آلَ اِلَيْهِ اَوْلًا' یعنی رجوع کرنا اور منحرف ہونا' تاویل الکلام سے مراد اس کی تشریح وتوضیح ہے۔ تاویل' خواب کی تعبیر کو بھی کہتے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ اَوْلٌ کے معنی رجوع کرنا اور کسی چیز سے منحرف ہونا کے ہیں' تاویل الکلام کے معنی اظہار و بیان ہیں۔ حدیث پاک میں ارشاد ہوتا ہے: مَنْ صَامَ الدَّهْرَ فَلَاصَامَ وَلَا آلَ ''جس نے ہمیشہ روزہ رکھا' نہ اس کا روزہ ہوا اور نہ اس نے (نیکی کی طرف) رجوع کیا''۔ بنابریں تاویل کا لفظ اَوْلٌ (رجوع) سے ماخوذ ہے' گویا جو شخص تاویل کرتا ہے وہ کلام کو اس کے متعدد معانی میں سے کسی ایک معنی کی جانب

لوٹاتا ہے۔ اگرچہ احتمال ان تمام معانی کا ہوتا ہے لیکن وہ ان میں سے ایک کو مراد لیتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تاویل 'ایالۃ' (سیاست وحکمرانی) سے ماخوذ ہے' گویا مؤوِّل (تاویل کرنے والا) کلام پر حکمرانی کرتا اور اسے مناسب موقع ومقام پر رکھتا ہے۔ اس حوالے سے مفسّر اور ماہر وعلم لغت زمخشری 'اساس البلاغۃ' میں لکھتے ہیں: آل الرَّعِيَّةَ اِيَالَةً حَسَنَةً وَهُوَ حَسَنُ الْاِيَالَةِ ''اس نے رعیت پر بہت اچھی طرح حکمرانی کی اور وہ بہترین حکمران ہے۔''

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تاویل کا لفظ متعدد آیات قرآنی میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے' مثلاً سورۂ آلِ عمران کی آیت ہے:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ﴾ (آیت ۷)

''پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی' گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور اس کی مراد معلوم کرنے کی وجہ سے۔''

اس آیت میں تاویل کا لفظ تفسیر وتعیین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾﴾

''پھر اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ (رجوع کرو) اللہ کی طرف اور رسولؐ کی طرف' اگر تمہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بہت اچھا ہے۔''

اس آیت میں تاویل سے نتیجہ اور انجام مراد ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ .....﴾ (آیت ۵۳)

''ان لوگوں کو کسی بات کا انتظار نہیں' صرف اس کے اخیر نتیجے کا انتظار ہے' جس روز اس کا اخیر نتیجہ پیش آئے گا.....''

نیز سورۂ یونس میں فرمایا:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ﴾ (آیت ۳۹)

''بلکہ ایسی چیز کو جھٹلانے لگے جس کو اپنے احاطہ علمی کے اندر نہیں لائے اور ہنوز ان کو اس کا آخری نتیجہ نہیں ملا۔''

ان دونوں آیات میں تاویل سے ایسے واقعہ کا ظہور پذیر ہونا مراد ہے جس کی کسی رسول یا نبی نے اطلاع دی تھی۔

سورۂ یوسف کی درج ذیل آیات ملاحظہ کریں: ﴿وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ (آیت ۱۶) ''اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے خوابوں کی تعبیر بھی سکھائے گا۔'' ﴿لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ﴾ (آیت ۳۷) ''تمہیں جو کھانا دیا جاتا ہے اس کے تمہارے پاس پہنچنے سے پہلے ہی مَیں تمہیں اس (خواب) کی تعبیر بتلا دوں گا۔'' ﴿وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝۴۴﴾ ''اور ہم ایسے شوریدہ پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں ہیں''۔ ان تینوں آیات میں تاویل سے مراد تعبیر خواب ہے۔

سورۃ الکہف میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۸﴾ ''اب مَیں آپ کو ان باتوں کی اصلیت اور وجہ بھی بتا دوں گا جس پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔'' نیز: ﴿ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۸۲﴾ ''یہ تھی اصل حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا''۔ ہر دو آیات میں تاویل سے ان افعال کا موجب و محرک مراد ہے' جو حضرت خضر نے کشتی کو توڑنے' لڑکے کو قتل کرنے اور دیوار کی تعمیر کے سلسلے میں سرانجام دیے تھے۔

سلف کے نزدیک تاویل کا اصطلاحی مفہوم

علمائے سلف کے ہاں تاویل سے دو مطلب مراد لیے جاتے ہیں:

(ا) کلام کے معنی و مفہوم کو واضح کرنا' خواہ وہ ظاہر کلام کے موافق ہو یا مخالف' اس صورت میں تاویل اور تفسیر مترادف ہیں اور ان میں کوئی معنوی فرق نہیں۔ مشہور تابعی مجاہد جب کہتے ہیں کہ علماء قرآن کی تاویل جانتے ہیں تو 'تاویل' سے ان کی مراد تفسیر ہی ہے۔ ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں اکثر یوں لکھتے ہیں: 'القول فی تاویل قولہ تعالٰی کذا و کذا ''فلاں قولِ باری تعالیٰ (آیت) کی تاویل یوں ہے'' یہاں وہ 'تاویل' سے تفسیر ہی مراد لے رہے ہوتے ہیں۔

(ب) علمائے سلف کی رائے میں کسی کلام سے جو مفہوم مراد و مقصود ہے' وہی تاویل ہے۔ سلف

کے نزدیک یہ تاویل کے دوسرے معنی ہیں۔ چنانچہ اگر کلام کسی طلب یا خبر پر مشتمل ہو تو جو فعل مطلوب ہے یا جو خبر دی جا رہی ہے وہی اس کی تاویل ہوتی ہے۔ اس وضاحت سے پہلے اور دوسرے معنی کا فرق پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

خلف کے نزدیک تاویل کا اصطلاحی مفہوم

علمائے خلف کی نگاہ میں تاویل کا مطلب یہ ہے کہ کسی دلیل کی بنا پر ایک لفظ کے راجح معنی کو ترک کر کے مرجوح معنی مراد لیے جائیں۔ اصولِ فقہ اور اختلافی مسائل میں تاویل سے یہی مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ علمی مبادلۂ افکار کے دوران جب ایک فریق کہتا ہے کہ یہ حدیث یا نص موّل ہے یا فلاں بات پر محمول ہے' تو دوسرا فریق اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ تاویل ہے اس لیے محتاجِ دلیل ہے۔ مذکورہ بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ تاویل کرنے والے سے دو باتوں کا مطالبہ کیا جائے گا:

(ا) وہ کسی لفظ سے جو مفہوم مراد لیتا ہے' اب ثابت کرے کہ آیا وہ لفظ اس معنی کے لیے استعمال ہوتا بھی ہے یا نہیں؟

(ب) وہ یہ بتائے کہ کون سی دلیل راجح معنی لینے سے مانع اور مرجوح معنی کی مقتضی ہے؟

اگر تاویل کرنے والا یہ دونوں باتیں ثابت کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کی تاویل فاسد اور وہ شرعی نصوص کا مذاق کرنے والا ٹھہرے گا۔ جمع الجوامع اور اس کی شرح میں لکھا ہے کہ ظاہر اور متبادر معنی کو ترک کر کے مرجوح معنی مراد لینے کو تاویل کہتے ہیں۔ اگر کسی دلیل و برہان کی بنا پر ایسا کیا جائے تو درست ہے۔ اگر ظنی دلیل کی بنا پر مرجوح معنی مراد لیا جائے تو فاسد' اور اگر یقینی یا ظنی کوئی دلیل بھی موجود نہ ہو تو یہ نصوص کے ساتھ مذاق ہے' تاویل نہیں۔ ابن تیمیہؒ کے بقول صفاتِ باری تعالیٰ کے مسئلہ میں جو تاویل متنازع فیہ ہے وہ یہی ہے' چنانچہ بعض علماء اس کی مذمت کرتے اور اس سے باز رکھتے ہیں' بخلاف ازیں علماء کا دوسرا گروہ تاویل کی تعریف کرتا اور اس کو واجب قرار دیتا ہے۔

تفسیر و تاویل کا فرق و امتیاز اور مختلف افکار و آراء

علمائے کرام کے ہاں اس امر میں اختلاف ہے کہ تفسیر و تاویل کے مابین کیا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اس فرق کا معلوم کرنا ایک دشوار علمی کام ہے اور وہی شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے

جوتوفیق ربانی سے بہرہ ور اور خاص علمی بصیرت کا حامل ہو۔ ابن حبیب نیسابوری لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں جن سے اگر تاویل وتفسیر کا باہمی فرق دریافت کیا جائے تو نہ بتا سکیں۔ (الاتقان)

تفسیر وتاویل کے مفہوم میں جو اختلاف پیدا ہوا ہے اس کی وجہ مصری فاضل امین الخولی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں تاویل کا لفظ وارد ہوا' پھر علمائے اصول اس لفظ کو ایک خاص اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرنے لگے' حالانکہ یہ لفظ متکلمین اہل مذاہب کی زبان وقلم پر عام طور سے جاری وساری ہے۔ (التفسیر: معالم حیاتہ)

اختلافِ اقوال سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے درج ذیل حوالہ جات پیش خدمت ہیں:

(۱) ابوعبیدہ اور علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ تفسیر وتاویل کے الفاظ مترادف ہیں اور ان میں کوئی فرق واختلاف نہیں پایا جاتا۔ متقدمین اہلِ تفسیر کا زاویۂ نگاہ بھی یہی ہے۔ (الاتقان)

(۲) امام راغب اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تفسیر کے لفظ میں تاویل کی نسبت زیادہ عموم پایا جاتا ہے۔ تفسیر کا لفظ عموماً الفاظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور تاویل معانی کے لیے' مثلاً خواب کی تعبیر کو 'تاویل الرؤیا' کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں تاویل کا لفظ اکثر وبیشتر کتب مقدّسہ کے لیے بولا جاتا ہے اور تفسیر کتب مقدّسہ ودیگر کتب کے سلسلہ میں۔ اسی طرح تفسیر کا لفظ زیادہ تر الفاظِ مفردہ کے ضمن میں بولتے ہیں اور تاویل جملوں اور مرکبات کے دوران۔ مزید برآں تفسیر کا لفظ الفاظ نادرہ غریبہ کی شرح وتوضیح کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً البحیرۃ' السائبہ اور الوصیلۃ وغیرہ یا جو معنی مقصود ومراد ہو اس پر روشنی ڈالنے کے لیے جیسے سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ الخ﴾ (آیت ۱۱۰) یا ایسے کلام کے' سلسلہ میں جس میں کوئی واقعہ مذکور ہو اور اس کے بغیر کلام کا مطلب سمجھ میں نہ آتا ہو' جیسے سورۃ التوبہ کی یہ آیت ﴿اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ﴾ (آیت ۳۷) ''بے شک مہینوں کا آگے پیچھے کر دینا کفر کی زیادتی ہے''۔ اس کے برخلاف تاویل کا لفظ بعض اوقات عام اور بعض اوقات خاص استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح کفر کا لفظ مطلق انکار کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور خاص باری تعالیٰ کے انکار کے لیے بھی' اسی طرح ایمان مطلق تصدیق کو بھی کہتے ہیں اور خاص دینِ اسلام کی

تصدیق اور ماننے کو بھی۔

(۳) امام ماتریدی کا کہنا ہے کہ تفسیر کے معنی قطعیت ویقین کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ اس لفظ کا یہی مطلب ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی مفہوم مراد ہے۔ اب اس کی اگر کوئی قطعی وحتمی دلیل موجود ہو تو وہ تفسیر پھر ٹھیک ہے' ورنہ یہ تفسیر بالرائے کہلائے گی جو کہ شرعاً بالکل ممنوع ہے۔ اس کے برعکس ایک لفظ میں جن مختلف معانی کا احتمال پایا جاتا ہو ان میں سے ایک کو ترجیح دینے کا نام تاویل ہے' اس میں قطعیت ویقین کا ہونا ضروری نہیں۔ (الاتقان)

(۴) ابوطالب ثعلبی اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ لفظ جس معنی کے لیے موضوع ہو' حقیقۃً یا مجازاً اس کے بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں' جیسے لفظ 'صراط' کی تفسیر طریقہ (راستہ) اور 'صیب' کی مطر (بارش) کے ساتھ' بخلاف ازیں کسی لفظ کے اندرونی اور باطنی مفہوم کے واضح کرنے کو تاویل کہا جاتا ہے۔ تاویل کا سہ حرفی مادہ 'اول' ہے جس کے معنی کسی چیز کے نتیجہ وانجام کی جانب رجوع کرنا کے ہیں' اس لیے حقیقتِ مراد سے آگاہ کرنے کو تاویل اور دلیل مراد کے اظہار واخبار کو تفسیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (الاتقان)

(۵) مفسر بغوی اور الکواشی کا قول ہے کہ تاویل کے معنی آیت سے ایسا مفہوم مراد لینا ہے جس کی اس میں گنجائش ہو' وہ مفہوم آیت کے سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہو اور کتاب وسُنّت کے بھی خلاف نہ ہو' جبکہ کسی آیت کے شانِ نزول اور متعلقہ واقعہ کے ذکر وبیاں کو تفسیر کہتے ہیں۔ (معالم التنزیل)

(۶) الاتقان کے مطابق بعض علماء کی رائے میں تفسیر کا تعلق روایت اور تاویل کا درایت کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۷) ابونصر القشیری کا کہنا ہے کہ تفسیر کا تعلق پیروی اور سماع سے ہے اور تاویل کا تعلق استنباط سے۔

(۸) کچھ مفسرین کے نزدیک ترتیبِ عبارت سے جو مفہوم مستفاد ہو' اس کے بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ اس کے برعکس عبارت سے جو مفہوم اشارۃً معلوم ہوتا ہے اس کے کشف و اظہار کا نام تاویل ہے۔ متأخرین کے نزدیک یہی بات مشہور ہے' مشہور مفسّر علامہ آلوسی نے روح المعانی کے مقدمہ میں اسی کی تائید کی ہے۔

مذکورہ بالا اقوال میں سے جو قول اقرب الی الصواب ہے‘ وہ یہ ہے کہ تفسیر کا تعلق روایت کے ساتھ ہوتا ہے اور تاویل کا درایت کے ساتھ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تفسیر نام ہے کشف و بیان کا‘ اور مرادِ ربّانی کا اظہار جزم و وثوق کے ساتھ اس وقت ممکن ہے جب وہ حضور اقدس ﷺ یا صحابہ کرام ؓ سے منقول ہو جو کہ نزولِ وحی کے چشم دید گواہ اور اس سے متعلقہ واقعات و حوادث سے بخوبی آگاہ و آشنا تھے۔ اصحابِ رسولؐ کے لیے یہ شرف کیا کم ہے کہ انہوں نے صحبت نبویؐ سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور مشکلاتِ قرآن کے فہم و ادراک میں آنحضرت ﷺ سے خوب استفادہ کیا۔ جبکہ تاویل میں یہ بات پیشِ نظر ہوتی ہے کہ ایک لفظ میں جس قدر معانی کی گنجائش ہے ان میں سے ایک معنی کو دلیل کی بنیاد پر ترجیح دی جائے۔ اس ترجیح کا انحصار اجتہاد پر ہوتا ہے اور اجتہاد کے ضمن میں اس کے مناسب وسائل و ذرائع سے مدد لی جاتی ہے‘ مثلاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس مفرد لفظ کے معنی لغتِ عرب میں کیا ہیں‘ سیاق و سباق کے اعتبار سے یہاں کون سے معنی اقرب الی الصواب ہیں۔ پھر عربی زبان کے حوالے سے اسالیب کلام کو دیکھ کر معنی کا استنباط کیا جاتا ہے۔ امام زرکشیؒ کا اس ضمن میں ارشاد ہے:

’’علماء نے تفسیر و تاویل کے مابین جس فرق و امتیاز کو ملحوظ رکھا ہے‘ اس کا سبب یہی ہے کہ تفسیر میں منقولات پر اعتماد کیا جاتا ہے اور تاویل کا مدار و انحصار استنباط پر ہوتا ہے۔‘‘

(الاتقان)

مفتی محمد تقی عثمانی نے اپنی کتاب علوم القرآن میں تفسیر اور تاویل کے فرق کے حوالے سے یوں روشنی ڈالی ہے:

’’قدیم زمانے میں تفسیر کے لیے ایک اور لفظ تاویل بھی استعمال ہوتا رہا ہے اور خود قرآن کریم نے بھی اپنی تفسیر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ آنے والے دور کے علماء میں اسی ضمن میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا یہ دونوں لفظ بالکل ہم معنی ہیں یا ان میں کچھ فرق بھی ہے!‘‘

امام ابوعبیدہ وغیرہ کا کہنا ہے کہ یہ دونوں الفاظ بالکل مترادف ہیں‘ دوسرے حضرات نے ان دونوں الفاظ میں فرق بیان کیا ہے‘ چند اقوال ملاحظہ کریں:

(ا) تفسیر ایک لفظ کی انفرادی تشریح کا نام ہے اور تاویل جملے کی مجموعی تشریح کا۔

(ب) تفسیر الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور تاویل اصل مراد کی توضیح کو۔

(ج) تفسیر اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال نہ ہو اور تاویل کا مطلب یہ ہے کہ آیت کی جو مختلف تشریحات ممکن ہیں‘ ان میں سے کسی ایک کو (شرعی) دلیل کے ساتھ اختیار کر لیا جائے۔

(د) تفسیر یقین کے ساتھ تشریح کرنے کو کہا جاتا ہے اور تاویل تردّد کے ساتھ تشریح کرنے کو۔

(ذ) تفسیر الفاظ کا مفہوم بیان کر دینے کا نام ہے اور تاویل اس مفہوم سے نکلنے والے سبق اور نتائج کی توضیح کا‘ وغیرہ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابوعبیدہ ہی کی رائے درست لگتی ہے کہ ان دونوں الفاظ میں استعمال کے لحاظ سے کوئی بنیادی فرق نہیں۔ جن حضرات نے یہ فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے ان کے شدید اختلافِ رائے پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس حوالے سے کوئی معیّن اور متفق علیہ اصطلاح نہیں بن پائی۔ اگر ان الفاظ میں حقیقتاً فرق ہوتا تو اس شدید اختلاف کا کوئی موقع نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے مفسرین ان الفاظ کے ساتھ ہم معنی الفاظ کا سا معاملہ کرتے ہوئے بلا تکلف ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ (جاری ہے) ❁❁❁

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحدید

(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

اشاعت خاص 500 روپے، اشاعت عام 225 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-03
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

Apr 2022
Vol.71

Regd. CPL No.115
No.4

Monthly Meesaq Lahore

موسس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نگران: شجاع الدین شیخ

رجوع الی القرآن کورس

افتتاحی تقریب

قرآن اکیڈمی ڈیفنس

22 مئی 2022

اتوار صبح 9 بجے

خواتین کے لیے شرکت کا باپردہ انتظام ہے

آغاز

درج ذیل اکیڈمیز میں

23 مئی 2022

بروز پیر

دورانیہ: 10 ماہ

صبح 08:45 تا دوپہر 01:00 بجے

پیر تا جمعہ

مضامینِ تدریس

سال اوّل

- بیان القرآن
- عربی گرامر
- قرآن حکیم کا منتخب نصاب
- ناظرہ قرآن حکیم و تجوید
- سیرت النبی ﷺ
- عقیدہ و فقہ
- توسیعی محاضرات
- فکر اسلامی
- ترجمہ قرآن حکیم مع ترکیب
- حدیث و سنت
- سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم

سال دوم

- علوم القرآن
- علم العقیدہ
- تفسیر القرآن
- اصول التفسیر
- علم الحدیث
- اصول الحدیث
- فقہ العبادات
- اصول الفقہ
- اللغۃ العربیۃ وادبھا
- فقہ المعاملات
- الفکر الاسلامی

ہاسٹل کی سہولت قرآن اکیڈمی یسین آباد میں صرف حضرات کے لیے دستیاب ہے

info@QuranAcademy.com www.QuranAcademy.com

قرآن اکیڈمی ڈیفنس	قرآن اکیڈمی یسین آباد	قرآن اکیڈمی کورنگی	قرآن انسٹیٹیوٹ گلستان جوہر	قرآن انسٹیٹیوٹ لطیف آباد حیدرآباد
021-35340022-4	021-36806561	021-35078600	021-34030119	0334-3350910
0334-3088689	0331-7292223	0343-1216738	0323-4030119	0345-2701363